جلد (۶) مارچ سنہ ۱۹۰۴ء نمبر (۶)

ایڈیٹر

شیخ عبد القادر بی اے

مخزن

اُردو علم ادب کی ترقی کا ماہوار مجموعہ

مضامین نثر

انگریزی اولیت کا خیال – سید سجاد حیدر بی اے – ۱
بیربل کی حاضر جوابی – سید علی حیدر (از عظیم آباد) – ۹
فارسی و سنسکرت – محمد شرف الحق (اکبرآباد) – ۹
یاد ایام گذشتہ – عزیز محمد خاں سکرٹری محبوب کلب دکن – ۲۱
وفت – پنڈت من موہن ناتھ زار زتشی – ۲۴
ڈولی – شیخ محمد اکرم – ۲۷
گنج تنہائی کا ایک گوشہ – شاہ محمد نذیر شبلی – ۳۲
دیہات اور شہر – محمد سعید دہلوی – ۳۶
محل خانہ – ایڈیٹر – ۳۹

مضامین نظم

چاند اور جگنو یا محبت – سید حسین (از دینا نگر) – ۱۱
رخصت اے بزم جہاں – محمد اقبال ایم اے – ۴۲
آرزوئے صحت – عبد الرشید چشتی مرحوم – ۴۴
صبح – سید علمدار حسین (از پٹیالہ) – ۴۵
کارنامۂ عشق – سید محمد جعفری رنجور (کلکتہ) – ۴۸
کلام شاد – ۵۴
کچکول – ۵۸

نو کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے ☐ ان شہروں میں اُردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے –

کارخانہ پیسہ اخبار کے خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں منیجر صاحب کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ عبد القادر بی اے مالک ایڈیٹر نے شائع کیا

سال تمام

الحمدللہ کہ اس رسالے نے اپنی عمر کے تین سال بخیریت ختم کرکے چوتھے سال میں قدم رکھا۔ قیمت اگرچہ وہی رہی مگر حجم ۴۸ صفحہ سے ۶۰ صفحہ تک پہنچ گیا۔ اگلے مہینے سے چار صفحہ اور بڑھائے جائینگے۔ اور رسالہ علاوہ سرورق اور اشتہارات کے ۶۴ صفحہ مضامین کے دیگا ہمیں قوی اُمید ہو کہ قدردانان مخزن اس کے روزافزوں مصارف کے لئے ترقی خریداران کے ذریعے گنجایش نکال دینگے۔ بعض چیدہ حضرات کی خدمت میں ایک چھوٹا سا اشتہار اس رسالہ کا پہنچے گا۔ جو اشتہار کا اشتہار ہو اور نمونے کا نمونہ۔ اُن سے التماس ہو کہ اُسے اپنے دوستوں تک پہنچائیں۔ اور اُنکو خریداری کی تشویق و ترغیب سے ہمارا حوصلہ بڑھائیں۔

ایڈیٹر

قلمی معاونین

نے

جو توجہ آج تک فرمائی ہے۔ اسکا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا۔ خدا اُنکے قلم میں زور اور اُنکی ہمت میں برکت دے۔ دو چار باتیں اگر ملحوظ رکھیں تو عین عنایت ہو:۔

۱۔ مضمون حتی الوسع جلی قلم سے اور خوشخط لکھیں۔

۲۔ کاغذ میں کفایت شعاری نہ فرماویں اور اسکے ایک ہی طرف لکھیں۔

۳۔ ایک ہی کاغذ پر کئی چیزیں نہ لکھیں۔ بعض حضرات ایک نظم اپنی۔ چند شعر دوسروں کے۔ چٹکلوں کے لئے۔ کوئی ہدایت مینجر کو لئے اور کوئی تحریر ایڈیٹر کے لئے سب ایک پرچہ پر لکھ کر لفافہ میں بند کر دیتے ہیں۔ اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے اور بسا اوقات کوئی نہ کوئی ہدایت عملدرآمد سے رہ جاتی ہے۔

۴۔ چٹکلوں کے حصے کی دلچسپی کو کچھ تو ہر خریدار کے دل میں اپنا نام درج کرانیکا شوق پیدا ہونے نے کھو دیا تھا۔ رہی سہی بات اسکو نمونے کی تقلید کی کثرت نے ڈبو دی۔ لہذا یا تو اسکی جگہ انتخابی اشعار کی کوئی اور صورت رکھی جائیگی۔ یا بعض لینا انتخاب درج ہوگا۔ ہاں اگر کوئی ایسے باذاق اصحاب ہونگے جنکا انتخاب نہایت پسندیدہ ہوا اور جو اُسے اپنا نام اسپر ثبت کرائے بغیر چھپوانا چاہیں گے تو اُنکی مہربانی سے فایدہ اُٹھا لیا جائیگا۔

۵۔ ناپسندیدہ مضمونوں کے واپس بھیجنے کا ہم ذمہ نہیں لیتے۔ گو خاص احباب کی خاطر خاص صورتوں میں ایسا ہوسکیگا۔

۶۔ غزلیں بہت سے صاحب بھیجتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ غزلوں کی اشاعت اس رسالہ کا اصل مقصد نہیں ہے۔ اسکا جزو تو بعض نامور اور متبرک بزرگوں کے کلام سے لگا ہے کہ مستفید ہونے کے لئے آئیں رکھا گیا ہے۔ اسمیں معمولی غزلوں کے لئے گنجایش بمشکل نکل سکتی ہے۔ نتیجہ خیز نظمیں اور معقول مضامین نثر زیادہ خوشی سے قبول کئے جائینگے۔

(ایڈیٹر)

مشتاق احمد زاهدي

شيخ محمد اكرام

منشي د يانرائن نگم

مرزا محمد سعيد

مخزن

ایک پولیٹکل خواب

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

بادشبگیر کی بھینی بھینی بُو عالم خواب میں بھی میرے دماغ کو معطر کر رہی تھی کہ تصوّر نے ایک نیا کرشمہ دکھایا۔ ایک عالیشان مکان میں جو دارالسلطنت کلکتہ کا گورنمنٹ ہاؤس معلوم ہوتا تھا۔ کسی بڑے بھاری جلسہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لوگوں سے پُوچھا تو معلوم ہوا کہ حضور نظام دکن وائسرائے ہند کے مہمان ہیں اور اسوقت تخلیہ کی مُلاقات ہو رہی ہے۔ جی میں آیا کہ جس طرح بن پڑے اندر چلے اور سُنئے کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں مگر ساتھ ہی دل نے کہا کہ سڑی ہوا ہے۔ رہتا ہی جھونپڑے میں اور خواب دیکھتا ہے محلّوں کا۔ تو اور گورنمنٹ ہاؤس کے اندرونی مناظر کا نظارہ اور وُہ بھی ایسی حالت میں جبکہ سرتاجِ مسند طرازانِ ہند اور نائب السّلطنت شہنشاہ ہندوستان باہم مل رہے ہوں اور خدا جانے کیسے کیسے اہم مسائل پر گفتگو کر رہے ہوں۔ پرندہ تو وہاں پر نہیں مار سکتا تو کیا جاسکیگا۔ لیکن میں بھلا کیا ماننے والا تھا۔ سر خُدا نے سب سے نرالا دیا ہے۔ اور سودا بھی اس میں سماتا ہے تو سب سے الگ۔ طرح طرح کی تدبیریں سوچنے لگا۔ آخر ذہن رسا نے اعانت کی اور ایک طریقہ حصُولِ مقصد کا سُوجھ گیا۔ لاٹ صاحب کے خانسامان میاں خدا بخش ہمارے لنگوٹیا یار تھے۔

سیدھا اُن کے پاس پہنچا اور اُنکو پرانی دوستی کا واسطہ دلا کر کہا کہ بھئی جس طرح ہو سکے ہم کو لاٹ صاحب اور حضور نظام کی باتیں سنوا دو۔ خدابخش نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے ابھی اندر پہنچائے دیتا ہوں۔ اور ایسی جگہ تم کو کھڑا کئے دیتا ہوں کہ سب باتیں بخوبی سُن سکو۔ آج میرا میٹی کریم خاں اتفاق سے بیمار ہو گیا ہے۔ بس اس کا لباس پہن لو اور جو کچھ تم سے کہوں کرتے جاؤ۔ کوئی تم سے یہ بھی نہ پوچھیگا کہ تمہارے مُنہ میں کتنے دانت ہیں۔ غرضکہ میں جھٹ کریم خاں کی چپکن ڈانٹ بٹن دار پاجامہ چڑھا اور بھتے دار وردی کا عمامہ اوڑھ چاء کے سامان کی ایک کشتی ہاتھ میں لئے اندر پہنچا۔ خدابخش نے اشارہ سے کہا کہ لاٹ صاحب اور نظام صاحب اس کمرہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تم اس پردہ کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ اور اطمینان سے جو چاہو سنو۔ میں پردہ کے پیچھے اپنے دوست خانساماں کے کہنے کے مطابق کھڑا ہو گیا۔ جہاں مجھ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کان لگا کر میں نے سُنا تو لاٹ کرزن صاحب اور حضور نظام کو حسب ذیل باتیں کرتے ہوئے پایا۔

لاٹ کرزن۔ یور ہائی نس برار کو واپس لے کر کیا کرینگے۔ خواہ مخواہ کی ذمہ واریاں بڑھ جائینگی اور نتیجہ ان ذمہ واریوں کے مقابلہ میں چنداں آپکے مفید مطلب نہ ہوگا۔ یور ہائی نس کے جو حقوق برار سے متعلق ہیں انکو ہم پوری طرح سے تسلیم کرتے ہیں لیکن امپیریل اغراض کا تقاضا یہی ہے کہ برار کا انتظام آپ ہمارے تفویض کر دیں۔ تاج برطانیہ کے ساتھ آپ کی دوستی کچھ آج کل کی دوستی نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ نے اُسپر مُہر لگا دی ہے۔ اور جب ہم آپ ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں تو ہم کو عمل بھی اس اصول پر کرنا چاہیئے۔ کہ آپس میں مل بانٹ کر کھائیں۔ برار اصل میں آپ ہی کا ہے ہم صرف اسکا انتظام لینا چاہتے ہیں۔ ننانوے سال کا پٹہ لکھ دیجئے اور کل انتظام مالی و ملکی ہمارے تفویض کر دیجئے۔ آپ پچیس لاکھ سالانہ ٹھیکہ ہم سے لیجئے۔ آپ کی سالگرہ والے دن برار کی دارالحکومت میں آپ کا جھنڈا بلند کیا جایا کریگا اور آپ کو توپوں کی سلامی دی جایا کریگی۔ غرضکہ آپ ہر حیثیت سے مالک رہینگے۔ اور ہم آپ کے کارکن۔ اور یہ آپ کے لئے بڑی عزت کی بات ہوگی کہ گورنمنٹ

عالیہ کو آپ اپنی اسامی کہ سکیں"۔

مَیں پردہ کے پیچھے سے آپ ہی آپ۔ حقیقت میں جایداد کی تقسیم اور مل بانٹ کر کھانے کے اصول کی توضیح اس سے بہتر نہیں ہوسکتی۔ یہ شعر اسی موقع کے لئے تھا۔

"از صحنِ خانہ تا بہ لبِ بام زانِ من
از بام خانہ تا بہ ثریا ازانِ تو"

حضور نظام۔ "یور لارڈشپ کو تفصیلِ مدعا کی ضرورت نہ تھی۔ آپ کی خواہش میری سر آنکھوں پر مجھے بھلا کسی بات سے انکار ہوسکتا ہے۔ دولت برطانیہ کی خیر خواہی اور دوستی میں میری جان بھی جائے تو حاضر ہے۔

میں دل بیچتا ہوں میں جاں بیچتا ہوں — میں ہستی کی ساری دکاں بیچتا ہوں
یہ لوح و قلم عرش و کرسی تو کیا ہیں — کوئی لے تو میں لامکاں بیچتا ہوں

آپ برار مانگتے ہیں۔ برار تو کیا پورا دکن برطانیہ پر سے تصدق ہے لیکن ایک بات میں یور لارڈشپ سے اس موقعہ پر کہنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو اپنی رعایا نہایت عزیز ہے۔ میرا وہ شعر آپ نے سنا ہوگا۔

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ — گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

برار آپ لیتے ہیں تو میری پیاری رعایا کے حقوق کی حفاظت کا خیال پوری طرح سے رکھیئگا۔ میں جانتا ہوں کہ انگریزی انصاف نے نوشیرواں کے زمانہ کی یاد بھی بھلا دی ہے لیکن انسان کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ جب اپنے کسی عزیز پیارے کو دوسرے کے سپرد کرتا ہے گو وہ دوسرا اسکا دلی دوست اور قریب سے قریب کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو لیکن پھر بھی تاکید ضرور کر دیتا ہے کہ اس عزیز کی پرداخت اچھی طرح سے کی جائے۔ آپ کو ہمارے ملک کی رسم معلوم ہے کہ جب دلہن عقد کے بعد دولہا کے ساتھ جاتی ہے تو اگرچہ دولہن کی ماں اس بات کو خوب جانتی ہے کہ اس کے داماد کو اپنی نئی بیاہی بیوی سے سچا عشق ہوگا لیکن پھر بھی وہ اپنے داماد سے کہتی ہے کہ دیکھنا میری بیٹی کو اچھی طرح سے رکھنا اسکو کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے دینا۔ اس لئے میں بھی آپ سے بمنت کہتا ہوں کہ میری رعایائے برار کے ساتھ عمدہ سلوک اور اچھا برتاؤ کیا جائے اور ان پر زیادہ ٹیکس

نہ لگائے جائیں"۔

لاٹ کرزن "۔ آپ اس کی طرف سے بالکل بے فکر رہیں۔ آپ کو انگریزی انصاف پر بھروسہ ہونا چاہئے۔ اور اس کے علاوہ یہ دُلہن کچھ آج کی بیاہی ہُوئی نہیں ہے۔ برار ہمارے پاس کئی سال سے موجود ہے اور وہاں کی رعایا ہم سے نہایت خوش ہے اور جو وجوہ اس امر کے محرک ہوئے کہ آپ سے استدعا کیجائے کہ برار ۹۹ سال کے لئے ہم کو ٹھیکہ پر دیدیجئے۔ اُن میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ رعایائے برار نہیں چاہتی کہ انگریزی حکومت جسکی وُہ اتنے عرصہ سے عادی ہو مغلئی حکومت سے تبدیل ہوجائے"۔

حضور نظام"۔ یہ میری قسمت۔ میں تو انکو اپنے بچوں کی طرح عزیز جانتا ہُوں"۔

میں (دبی زبان سے) اگر حضور اپنی قسمت کا اندازہ برار کے باشندوں کی عقیدتمندی ہی سے کرنا چاہتے ہیں تو حضور کی قسمت نہایت زبردست ہے۔ وہاں کے لوگ دل وجان سے آپ ہی کے ظلِّ حمایت میں رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کچھ دن ہوئے کہ وہاں کے لوگوں نے اس مضمون کا ایک محضر گورنمنٹ بمبئی کی خدمت میں بھیجا تھا"۔

لاٹ کرزن "حضور کی فیاضی اور وفا پروری کی جس قدر تعریف میں نے سُنی تھی وُہ سب سچ تھی۔ جیسا میں نے حضور کو سُنا تھا اُس سے بڑھ کر پایا۔

کرہائے تو مارا کرد گستاخ

اب میں آپ سے کچھ اور کہنا چاہتا ہُوں۔ لیکن جو کچھ میں اسوقت کہونگا وُہ محض دوستانہ مشورہ اور آپ کی ہوا خواہی ہوگی۔ بات اصل میں یُوں ہے کہ امپیریل اغراض اِس بات کو چاہتی ہیں کہ حکومت شاہنشاہی کے تمام عناصر ایک مرکز پر لائے جائیں اور دولت عالیہ کا شیرازہ ایسا باندھا جائے کہ تفریق عناصر سے اسکا بکھرنا متعذر ہو۔ چونکہ سکۂ رائج الوقت اور انتظام ڈاک شاہنشاہی کے عناصر میں شمار ہوتے ہیں۔ لہٰذا قرینِ مصلحت یہی ہے کہ ان دونوں کے متعلق بھی وہ حقوق جو اسوقت تک آپکو حاصل رہے ہیں بہ اقتضائے دوستی دیرینہ گورنمنٹ عالیہ کو دیدیجئے۔

حضورِ نظام ۔ "مجھے تو کسی بات میں عذر نہیں ۔ میں دولت برطانیہ کا جان نثار دوست ہوں اور اپنی پالیسی کو اِس بارہ میں وقتاً فوقتاً ظاہر کرتا رہتا ہوں ۔ میرے یہ اشعار آپکے گوش زد ہوئے ہونگے ۔

سرکار دونوں رکھتے ہیں باہم جو اتحاد
یہ دوستی ہے سارے زمانے پر آشکار

مجھ کو نہیں دریغ کبھی جان و مال سے
جانینگے اور جانتے ہیں اہلِ روزگار

اَے اہلِ فوج دل سے اطاعت وُہ تم کرو
سمجھیں جنابِ قیصرِ ہند اپنا جاں نثار

تم خیر خواہ دولتِ برطانیہ رہو
اِس سے ہی کامگار ہو اس سے ہی نامدار

لیکن چُونکہ آپ میرے دِلی دوست اور دولتِ برطانیہ کے متوسّل و ہوا خواہ ہیں ۔ اِس لئے مَیں بھی آپ کو ایک دوستانہ مشورہ دیتا ہُوں جو آپ کے اور آپ کی قوم دونوں کے لئے مفید ہوگا وُہ مشورہ یہ ہے کہ سکّہ اور ٹپہ کے انتظام کی تبدیلی کو بالفعل آپ ملتوی رہنے دیں ۔ انضمام برار اور دُوسرے مہتم بالشان مہمات الامور کے سرانجام دینے سے آپ نے اپنے زمانہ ویسرائلٹی میں جو یادگار زمانہ اعزاز حاصل کیا ہے وُہ بجائے خود ایسا ہے کہ میری ریاست کے سکّہ کی تبدیلی اور میرے ٹپہ کے انتظام کے لے لینے سے اُس میں کوئی نمایاں زیادتی نہیں ہو سکتی ۔ خُدا دولتِ برطانیہ کو سلامت رکھے ابھی بہت سے وائسرائے ہندوستان میں آنے والے ہیں ۔ اگر یہ سب امور آپ ہی کے عہد میں طے ہو جائیں تو اُنکے لئے کیا باقی رہیگا ۔ سکّہ اور ٹپہ کے مسائل کے تصفیہ کو آپ اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑیئے ۔"

* * * * * * *

* * * * * * * *

مَیں یہانتک سُننے پایا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی اور مَیں نے اپنے آپ کو اپنی ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر کروٹ بدلتے پایا ۔

راقم

چلا تو ہُوں سپئے اظہارِ دردِ دل دیکھوں
حضورِ یار مجالِ بیاں رہے نہ رہے

بقلم شیدی عنبر

نیرنگیٔ روزگار

اِسلام کی ابتدائی تاریخ اور پیغمبرِ عرب کے صحابہ خاص میں جو نام باعتبارِ قابلیتِ علمی و خوبی و لطافت بیان ممتاز ہے وُہ اُنکے پیارے داماد جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب کا ہے۔ یہ اقتباس اُن کے کلام معجز نظام میں سے ہے۔ گو اصلی عربی زبان کی خوبی تو اس ترجمہ میں کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی کافی اندازہ حضرت موصوف کی پاکیزگیٔ خیالات اور فصاحت کا ہو سکتا ہے :-

وُہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہا کرتے تھے اور قوی تن لوگ اُن کی حفاظت کے لئے موجود تھے مگر بلندیٔ کوہ نے انہیں کوئی نفع نہیں پہنچایا۔ جب موت غالب ہوئی تو وُہ اپنی جائے پناہ سے قبروں کی طرف نیچے اتارے گئے۔ افسوس وُہ مقام کیا بُرا ہے۔ جہاں وُہ نازل ہوئے۔ دفن کے بعد ندا دینے والے نے ندا دی کہ اب وُہ رختِ شاہی اور تاج و تخت کہاں ہیں اور وُہ چہرے کیا ہوئے جو نقابِ اجلال میں پنہاں رہتے تھے اور جنکے سامنے پردے ڈالے جاتے تھے اور قناتیں کھڑی کی جاتی تھیں۔ پس جب اہلِ قبور اُن سے سائل ہوئے تو قبروں نے سارا حال آشکار کر دیا کہ یہ وُہی چہرے ہیں جن پر اب کیڑے رینگتے ہیں۔ ایک عُمر تک اُنہوں نے دُنیا میں خوب کھایا پیا۔ عیش سے بسر کی اور ایک مدتِ طویل کی خورش کے بعد کیڑوں نے انہیں خود کھا لیا۔ اب عرصہ تک اُنہوں نے مال کثیر پیدا اور جمع کیا مگر وُہ خود چلے گئے اور اُسے دشمنوں کے لئے چھوڑ گئے۔ اپنی جان کی حفاظت کے لئے اکثروں نے مستحکم اور پائدار عمارتیں بنوائیں۔ مگر انجام یہ ہوا کہ اُن مکانوں اور مکینوں سے وُہ خود رخصت ہوئے اور مفارقت کی۔ اُن کے گھر خالی۔ ویران اور پُر ہول ہو گئے۔ یہانتک کہ اُنکے ساکن بھی قبروں میں جا پہنچے۔

صاحبِ حکومت سے پُوچھ جسوقت اُس کی موت آئے کہ اب وُہ فوجیں۔ گھوڑے اور

خدم و حشم کیا ہوئے۔ وُہ خزانے کدھر ہیں جنکی کُنجیاں اُٹھاتے وقت قوی تن تھک جاتے تھے۔ وُہ خدام کس طرف ہیں جو باسازوسامان دربار میں آٹھ پہر حاضر رہا کرتے تھے۔ وُہ تیغیں خود اور نیزے کہاں ہیں۔ وُہ سوار۔ وُہ غلمان اور پیادے کدھر گئے۔ اُنہوں نے اپنے حاکم کے ساتھ کیا کیا۔ وُہ شمشیریں وُہ نیزہ ہائے خطی کیا ہوئے جنکی سنانیں باریک تھیں۔ وہ حمائتی گروہ کیا ہوا اُس نے اُس وقت اُس کی خبر نہ لی جبکہ اُس نے دیکھا کہ وُہ خاک پر پڑا آہ وزاری کر رہا ہے۔ وُہ مردانِ قوی ہیکل کہاں ہیں جن کی طبیعتیں عالمِ غیظ و غضب میں برہم ہو جاتی تھیں۔ وُہ جان نثار مدد دینے والے کدھر گئے۔ جن سے مال و دولت کی نگہبانی ہوئی تھی۔ وہ تیر انداز کیا ہوئے اُنہوں نے اپنے تیروں سے موت کے چلتے ہوئے تیروں کو نہ روک لیا۔ جب وُہ اس کے قریب آپہنچے افسوس اُنہوں نے ظلم و ستم کو باز نہ رکھا۔ تجھ سے موت کو دفع نہ کیا۔ جب وُہ تیرے پاس آپہنچی۔ رشوتوں سے بھی نہ روکا حالانکہ تو نے خرچ کیا۔ نہ افسوس سے کچھ کام چلا اور نہ حیلوں سے۔ عزیز و اقربا نے بھی مدد نہ کی۔ بلکہ بدترین فعل کے ساتھ تجھے موت کے حوالہ کر دیا۔ اے شخص۔ تیری قبر کا کیا حال ہے۔ اب کوئی اُس کے نزدیک نہ جائیگا اور نہ اُن میں سے کوئی اُس کے گرد پھریگا۔ تیرا ذکر لوگ فراموش کرینگے۔ اور تو ہمیشہ کے لئے متروک کر دیا جائیگا۔ کیونکہ سب کے سب تقسیم مال میں مشغول ہیں۔ تیرا مکان وحشتناک ہو جائیگا۔ کوئی اُس میں مونس و غمخوار نہ رہیگا۔ اور اس کے دونوں جانب سے خوف و ہراس تجھے ڈھانپ لیگا۔ اِس امر کو مان لے کہ دُنیا کسی بادشاہ کا ساتھ نہیں دیتی۔ ایک دن موت ضرور نازل ہوگی۔ پھر یہ کیونکر اُمید ہو سکتی ہے کہ زندگی کو ہمیشہ ثبات ہے۔ کیونکہ اس کی رُوح میں موت بھی پیوستہ ہے۔ اُس کا جسم تیرہائے ہلاکت

کانشنہ ہے اور اُس کی بادشاہت فانی اور اُسے قرار نہیں ہے +

سید علی سجاد (از عظیم آباد)

سیاقِ دکن - علم سیاق کے شائقین اور دیگر حضرات جنہیں حساب کتاب سرکاری رکھنے کے پُرانے طریقوں سے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت یا مذاق ہو۔ یہ سُنکر نہایت خوش ہونگے۔ کہ نوّاب عزیز جنگ بہادر وظیفہ یاب سرکار نظام نے نہایت عمدہ اسلوب سے ایک کتاب "سیاقِ دکن" نام تیار کی ہے۔ جس میں سیاق عرب و عجم و ہند و دکن کی تاریخ اور اصطلاحات اور ترتیب حسابات کے نمونے اور نقشے بسط کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ کتاب کوشش سے چھاپی گئی ہو۔ اور ایک خوبصورت جلد سے مزیّن ہے۔ مولانا شبلی نے جو رائے اسکے متعلق تحریر فرمائی ہے۔ اس سے ہمیں اتفاق ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"نواب صاحب موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے صرف حسابی سیاق کے متعلق ۱۹۶ صفحہ کی کتاب تیار کر دی جو عجیب و غریب تحقیقات سے لبریز ہے۔ فن سیاق کے متعلق نواب صاحب موصوف نے، اہم مصطلحات دریافت کئے ہیں۔ جن میں سے ہم اکثر کے نام سے بھی آشنا نہ تھے - اس کتاب کی قیمت ہے روپیہ رکھی گئی ہے۔ ہم نے نواب صاحب سے قیمت کی زیادتی کی شکایت کی تھی۔ لیکن نواب صاحب نے اس معقول جواب سے ہم کو ساکت کر دیا کہ قدر دانوں کے لیے یہ بھی کم ہے اور نا قدر دانوں کے لئے کم سے کم قیمت بھی زیادہ ہے"۔ ہاں ہم اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ گو نواب صاحب کا جواب معقول ہو۔ مگر قیمت کو دیکھتے ہوئے کاغذ جو استعمال کیا گیا ہو نظر میں جچتا نہیں۔ یقیناً اس سے بہتر کاغذ کی اس قیمت میں گنجائش تھی۔

فارسی سکّوں پر

جب ہم نے سُنا کیا بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مہذّب دُنیا کے چند مشہور کُتب خانوں میں (عجائب خانوں کے سوا) قدیم قلمی کتابوں کے ساتھ پُرانے سکّے بھی بے تعداد جمع ہیں تو ہمیں اُن کے سمجھنے اور حالات پڑھنے کا شوق دامنگیر ہُوا۔ یہ قُدرتی بات تھی کہ ہمیں ان بیش قیمت مجموعوں پر سرسری نظر ڈالتے وقت اپنے ملک اور قوم کا خیال قائم رہا اور ارادہ ہُوا کہ جس طرح گذشتہ مارچ کے علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ہم نے بہی خواہانِ قوم کی خدمت میں ایک مختصر فہرست اُن مشرقی قدیم کتابوں کی پیش کی تھی جو ہمارے ہی بزرگوں کی دماغی قوّت سے پیدا ہُوئی اور ہمارے ہی جواہر رقم ہاتھوں سے لکھی گئی اور آخر ہماری میراث سے نکلکر غیر ممالک میں مغربی قوموں کے قبضۂ اختیار میں ہمیشہ کے لئے جا پڑی تھیں۔ اُسی طرح ناظرینِ مخزن کو اس مرتبہ یُورپ کے مشہور کُتب خانوں کے ایک دُوسرے پہلو یعنی سکّوں کے مجموعوں کی طرف متوجّہ کرنے کی جُرأت کریں۔ اُمّید ہے کہ وُہ اس مسئلت کو اُسی دلچسپی سے دیکھیں گے جو اُنہوں نے پہلی بار فرمائی تھی۔

قدیم اسلامی سکّوں کے معائنہ سے ہمارا خیال ہے کہ ایک مفصّل تاریخ شاہانِ سلف کی لکھی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسے کام کے لئے ضرورت ہے معقول وقت کی جو ہمیں میسّر نہیں۔ برسوں کی محنت درکار ہے۔ گو یہ ظاہر ہے کہ ہماری جدید زبان میں ایسی کوئی تاریخ بے فائدہ نہ ہوگی۔ نیز ہمارے کُتب خانے میں اُس مجمُوعہ کا مہیّا کرنا ضرور مفید ہوگا جس سے وُہ تاریخ لکھی جا سکے۔ ہم اس موقع پر اپنے بیان کی تائید میں آٹھویں صدی ہجری کی ایک مثال پیش کر سکتے ہیں۔ اسی زمانے میں ہماری سرکار ہند نے ایک مہم ہمالیہ کے راستوں سے تبّت کو روانہ کیا ہے۔ ہمارے تاریخ دان حضرات کو اس سے وُہ واقعہ ضرور یاد آتا ہوگا

کہ سُلطان محمد بن تغلق نے تقریباً سات سو برس پہلے اسی قسم کا ارادہ عمل میں لانا چاہا تھا جس کو اُس زمانے کی مشکلات نے کامیاب نہ ہونے دیا تھا۔ اِس سُلطان کی نشانیاں جو کچھ بچی بچائی باقی ہیں۔ بس وُہی چند کھنڈر بھائیں بھائیں کرتے دہلی کے قُرب وجوار میں سرنگون کھڑے ہیں۔ اب اُن خاک پتھر کے ڈھیروں سے محمد بن تغلق کے متعلق کوئی سوال کیا جائے تو سوائے اِس کے کہ وُہ اُلٹا ہمیں سے جواب طلب کریں اور کچھ حاصل ہونا ناممکن۔ تاریخ کی کتابوں سے جن کے اصلی قدیم نسخے غائب ہیں بلکہ اُن کی صحیح نقلیں بھی۔ کم سے کم ہمارے اپنے کُتب خانوں سے۔ کچھ کچھ حال پڑھا جا سکتا ہے۔ البتہ سچی بول اُٹھنے والی نشانیاں وُہ کتبے ہیں جو دھات یا بھرت کے صفحوں پر کندہ ہیں۔ بدقسمتی سے یہ بھی ہمارے شوق اور قبضہ سے باہر ہیں۔ کسی عالیشان عمارت کی تعمیر شروع کرنے سے پیشتر اُس کے نیو میں رائج الوقت سکّوں کو چُنوا دینا ایک پرانا رواج ہے جس کی تقلید علیگڈھ کالج کے سٹریچی ہال کی افتتاحی رسم میں بھی کی گئی تھی۔ اکثر دفعہ نوسی عمارتوں کی بنیاد کھودتے وقت ٹکڑے مل گئے ہیں جن پر اُبھرے ہُوئے حرفوں میں بالکل صحیح "تاریخ بنا" کے سوا اور بھی بہت کچھ لکھا ہُوا نظر آگیا ہے۔ ایسا کہ کتابوں کی ٹٹول سے بھی حاصل نہ ہو۔ سلطان محمد بن تغلق کی اس طرح کی بھرت کی نشانیوں سے نہ صرف اُس کے عہد کے واقعات بلکہ اُس کے دل کے اندرونی حالات۔ اُس کی خوبیوں اور کمزوریوں کی سچی تصویر نگہ کے سامنے آجاتی ہے۔ اُس کی ابتدائی بااِفراط دولت۔ جو اُس کو شروع حکومت میں حاصل تھی۔ جس کی پہلی ضرب کے سکّے گواہی دیتے ہیں۔ چاندی سونا بھی کھرا اور وزن بھی پُورا پُورا تھا۔ بعد میں اُس کی مفلسی۔ جو دارالخلافہ کے بدلنے اور تبت کے مہم کا نتیجہ تھی۔ اُنہی سکّوں سے ظاہر ہے جو خزانے کو دوبارہ مالامال کرنے کی غرض سے ڈھالے گئے تھے۔ زر کھوٹا اور وزن گھٹا ہُوا۔ زاں بعد یہ بھی موقوف اور کوشش کی گئی کہ تانبے کی ضرب کا وُہی مول ہو جو چاندی کا پہلے تھا۔ اِس سے

اور بھی گھاٹا آیا - تجارت ستیاناس ہو گئی - پھر آنکھیں کھلیں - اور راستبازی سے کام لیا جانے لگا۔ جس سے جو نتیجہ ہوا بعد کے سکوں سے ظاہر ہے سنہ ۷۴۳ ہجری میں مذہبی اندیشے بھی سکوں سے نمایاں ہیں - اُس سے پہلے تغلق خاندان کے سلطانوں نے خلیفہ کا نام سکوں پر سے صاف کر دیا تھا - محمد بن تغلق کی سلطنت کمزور ہو گئی تھی - اُس کے خوف سے خلیفہ کا نام بار دیگر سکوں پر چڑھایا گیا - کچھ عرصہ بعد اور بھی تخفیف ہوئی - اپنی تخت نشینی کی منظوری خلیفہ سے کبھی مانگی نہ تھی - اس لئے سکوں پر سے اپنا نام بالکل اُٹھا دیا اور صرف خلیفہ المستکفی باللہ قائم رکھا - کچھ عرصہ بعد خلیفہ مذکور کے جانشین خلیفہ العبّاس احمد نے جب دہلی کی حکومت کی منظوری بھیجی تو محمد بن تغلق کا نام پھر سکوں پر نظر آنے لگا - یہ تمام کارروائیاں سکوں کے نقش سے تاریخ وار روشن ہیں - جن کا سلسلہ آسانی سے قائم کیا جا سکتا ہے اور تاریخ لکھنے والوں کو جن سے بہت کچھ قابلِ اعتبار مدد مل سکتی ہے - تغلق جیسے منچلے اور بھی بہت سے انسان صورت کرۂ زمین کے مختلف حصوں پر اپنی خود مختاری کا سکہ جما چکے ہیں - جن کے کارنامے سفید یا سیاہ صورت میں اُن کی بے زبان یادگاروں سے نمایاں ہیں -

کبھی ہم دیکھتے ہیں فلان ابنِ فلان تھا - کبھی کوئی صاحبقران تو کوئی صاحبقرانِ ثانی - کوئی بُت شکن تو کوئی حامیٔ دین - کبھی کوئی گنگو بہمنی - کوئی فاتح خود مختار تو کوئی باج گذار - کسی کا لقب کچھ اور حوصلہ کچھ - غرض اُن کی حکومت اُن کی وسعت - اُن کا جلوس - اُن کی دولت - انکی فتوحات اور خیرات - طبیعت کا میلان اور مذہبی اعتقاد - سیاحت اور سیاست - زبان اور دار الخلافۃ - بعض دفعہ خود انکی تصویر اور شجاعت اور قناعت وغیرہ کی سچی حقیقت اُن کے سکوں سے روشن ہو جاتی ہے -

مسلمانوں میں عموماً دستور رہا ہے کہ حکومت کی باگ ہاتھ میں آتے ہی اپنے نام مقام اسلام اور رہام کی ضرب ضرور بٹھا دیتے تھے - اس لئے جدا جدا ممالک کے

سکّوں کا حال لکھے جانے کے لئے خاصہ مصالح اکھٹا ہوسکتا ہے۔ لیکن سجع کی خصوصیت بس ہندوستان اور ایران ہی پر ختم ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں اس کی ابتدا ہوئی۔ مدتوں رواج رہا اور رنگینی کے لحاظ سے تھی بھی اعلیٰ۔ اِسی واسطے ہمیں اِسی سے خاص دلچسپی ہونی چاہیے

ہمیں کس قدر خوشی ہوتی جو اثنائے تحریر میں ہم لکھ سکتے کہ سکّے جن جن پرسے سجع اُتارا گیا ہے۔ ہندوستان کے کسی کُتب خانے میں جمع ہیں۔ اُمید کہ یہ مسرّت کسی دُوسرے نامہ نگار کو حاصل ہو۔ جو ہمارے بعد اِسی زمین میں لکھنے کی کوشش کرے۔

ہمیں یاد ہے سرسیّد مرحوم نے بہت شوق سے بادشاہانِ سلف کے فرامین اکھٹے کرنے شروع کئے تھے۔ سکّے بھی اُنہی کے حکم سے ڈھلے تھے جنہوں نے فرمان جاری کئے بلکہ بہ نسبت فرمانوں کے یہ زیادہ دیرپا یادگاریں ہیں۔ فرامین بغیر رسُوخ کے ملنے مشکل۔ سکّے عام ہاتھوں میں پھرا کرتے تھے۔ اب بھی ایسوں کے پاس سے دستیاب ہوسکتے ہیں جنہیں اُن کی قدر نہیں۔ سفر اور حضر دونوں میں تلاش ہوسکتی ہے۔ پس جن حضرات کو مدرسۃ العلوم کے کتب خانے میں پرانے فرامین اور قدیم قلمی کتابوں کے اضافہ کا مُبارک خیال ہو اُن سے التجا ہے۔ کہ سکّوں کو فراموش نہ کریں۔ یہ بھی گئے وقتوں کی شان و شوکت کی خاموش شہادتیں ہیں۔ نیز وُہ حضرات جو اپنے خانگی مجموعوں کے بڑھانے کی فکر میں ہوں۔ اُن کے حق میں ہماری دُعا ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔ اور عوام الناس کی دلچسپی کے لئے ایسا کرتے ہوں تو خُدائے تعالےٰ اُن کے کام میں برکت دے۔

برطانیہ کلاں کے عجائب خانوں اور کُتب خانوں میں جو سکّے ہیں اور جن کی فہرستیں بھی لکھی جاچکی ہیں اُن کے معائنہ سے واضح ہوتا ہے کہ سب سے قدیم سکّہ جس پر سجع لکھا ہے سلطنت گجرات کا ہے۔ تحقیق سے کہنا مشکل ہے کہ نظم میں سجع لکھنے کی رسم یہیں سے آغاز ہوئی۔ بہرحال محمد کریم شاہ گجرات کے ۹۴۶ ہجری کے سکّے پر

حسبِ ذیل سجع تھا :-

(۱) تا بدار الضرب گردوں قرصِ مہر و ماہ باد
سکّۂ سلطان غیاث الدّین محمد شاہ باد

ایک سجع عربی میں ۹۲۵ھ ضرب کا نشان اِس طرح تھا :-

(۱) نادِ علیّاً مظہر العجائبِ
تجدہُ عوناً لک فی النوائبِ
کُلّ ہمٍّ و غمٍّ سینجلی
بولایتک یا علی یا علی یا علی

اِسی دسویں صدی میں اکبر اعظم نے اپنے خاندان میں سب سے پہلے سکّوں پر سجع نقش کرایا۔ اُس کے والد ہمایون شاہ کے سکّوں پر جس کا دار الضرب بابر شاہ کی طرح لاہور تھا۔ (اور کہیں بھی ہو) حسبِ ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی جس کی شروع شروع میں اکبر نے بھی تقلید کی۔

"یرزُق اللہُ من یشاءُ بغیرِ حساب"
(خدا جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے)

اور اکثر بابر اور ہمایوں کی طرح کلمہ بھی لکھا گیا تھا۔ لقب عموماً "السّلطان الاعظم الخاقان المکرم" یا "سیّد السّلاطین" (ہمایون) ہوتا تھا۔ یہ ٹوڈرمل کا رسُوخ تھا جس نے عربی کو سکّوں پر سے اُڑا کر فارسی جاری کرائی۔ آخر آخر میں لقب صرف غازی اور بادشاہ رہ گیا تھا۔ تیموریہ خاندان کے بادشاہوں کے سکّے خوبصورتی کے لحاظ سے آجکل کے سکّوں کو بھی مات کرتے ہیں۔ خط کبھی ریحانی اور کبھی نعلیق ہوتا تھا۔ اکبر نے سکّوں کی وضع کو طرح طرح سے بدلا تھا۔ سونے کا سکّہ کچھ عرصہ تک گول سے چوکور ڈھلتا رہا۔ ازاں بعد چاندی بھی چوکور کی گئی۔ جو آخر تک اُسی طرح ڈھلتی رہی۔ اور کبھی سکّوں

کی تراش لوزات کی طرح ہوتی تھی۔ جس کو "محرابی" کہتے تھے۔ اب بجائے اِس کے کہ مختلف تیموریہ بادشاہوں کے سکّوں کا حال گڈمڈ کر کے دکھایا جائے۔ ہم نے نام اور تاریخ کے لحاظ سے تفریق کر کے جُدا جُدا کیفیت بیان کی ہے اور بادشاہوں کے جلوس اور مُدّتِ سلطنت کی تاریخ بھی اُن کی ضرب کے مطابق لکھی ہے۔

اکبر اعظم ۔ سنہ ۹۶۳ ۔ سنہ ۱۰۱۴ ہجری

شیخ ابوالفضل نے جب آئینِ اکبری لکھی تو تالیفِ کتاب کے وقت اُس میں دکھایا تھا کہ چاندی کے ساتھ ساتھ خالص سونے کا سکّہ صرف ۴ جگہ حسب ذیل ڈھالا جایا کرتا تھا:۔

(۱) فتح پور۔ (۲) ڈھاکا۔ (۳) الہ آباد۔ (۴) کابل۔

محض چاندی کا سکّہ ۱۰ شہروں میں جنکے نام یہ تھے:۔

الہ آباد۔ آگرہ۔ اجمین۔ سورت۔ دہلی۔ پٹنہ۔ کشمیر۔ لاہور۔ مُلتان۔ ٹانڈہ۔

اور تانبہ کا سکّہ ذیل کے ۲۳ مقامات میں:۔

اجمیر۔ اودہ۔ اٹک۔ الور۔ بدآون۔ بنارس۔ بھکر۔ بھیرہ۔ کالپی۔ گوالیار۔ گورکھپور۔ کلانور۔ لکھنؤ۔ مندو۔ ناگور۔ سرہند۔ سیالکوٹ۔ سرونج۔ سہارنپور۔ سارنگپور۔ سنبھل۔ قنوج۔ اتنبھور۔

لیکن خاندانِ مغلیہ کے سکّوں کی فہرستیں جو مشہور مجموعوں کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ اُن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ مقامات کے سوا چند اور شہروں میں بھی سکّے ڈھالے گئے تھے جو غالباً آئینِ اکبری کے لکھے جانے کے بعد مامور ہوئے ہوں۔ مثلاً جن مختلف سکّوں کا پتہ چلا اور جو خواص و عوام کے معائنہ میں آسکتے ہیں۔ اُن کے دارالضرب نیچے مرقوم ہیں۔

احمدآباد۔ بُرہان پور۔ ٹھٹہ۔ نارنول۔ جون پور۔ اودے پور (محمدآباد) اُردوئی

ظفرقرین - اردو - اسیر - سیتاپور - دوگام - مالپور - بیراٹھ -

دونوں فہرستوں کو ملانے کے بعد بھی یقین نہیں ہوسکتا کہ کہیں اور بھی سکّہ ڈھلانہ ہو جوئیندہ یابندہ کا مضمون ہے -

اکبر اعظم کے سکوں پر جو کچھ نثر میں لکھا ہوتا تھا اُسکا بیان ہمارے مضمون کی وسعت سے باہر ہے - اس لئے ہم صرف ابیات پر اکتفا کرتے ہیں - لیکن اس قدر اور بھی لکھینگے کہ اسی بادشاہ کے زمانے میں دارالضرب آگرہ کو سکّوں پر کبھی بلدہ کبھی دارالخلافہ اور دہلی کو حضرت دہلی - لاہور کو دارالسلطنتہ - دوگام کو دارالاسلام اور لاہور - احمد آباد - گوالیار - اور جونپور کو دارالخلافتہ کے لقب سے ممتاز کیا تھا -

اکبر اعظم کے سکّے جو مشہور عجائب خانوں میں جمع ہیں - اُن پر اس طرح سجع کندہ ہے -

(۱) مہر مُہرِ شاہِ اکبر آبروئے ایں زر است
تا زمین و آسماں را مہرِ انور زیور است

(۲) زر است از مہرِ اکبر بادشاہ نُور
بر آں زر نام شہ نُورٌ علےٰ نُور

(۳) ہمیشہ ہمچو زرِ مہر و ماہ رائج باد
بضرب دشرق جہاں سکّہ الہ آباد
جہانگیر - ۱۰۱۴ سنہ ہجری

سلیم کے سکّوں کے معائنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے عہد میں کم سے کم چودہ دارالضرب تھے - آگرہ - لاہور - دہلی - احمد آباد - بُرہان پور - پٹنہ - سورت - ٹھٹھہ - کابل - اجمیر - جہانگیر نگر یا ڈھاکا - اکبر نگر یا راج محل - کشمیر اور قندہار -

سلیم نے آگرہ کو شہر آگرہ خسرو پناہ ملقّب کیا - سلیم ہی کے سکّوں پر سب سے زیادہ سجع دیکھے گئے - جس سے اُس کی رنگین طبیعت کا پتہ چلتا ہے -

(۱) مالک الملک سکّہ زد بر زر
شاہ سُلطان سلیم شاہ اکبر

(۲) رُوئے زر را ساخت نُورانی برنگِ مہر و ماہ
شاہ نورالدّین جہانگیر ابنِ اکبر بادشاہ

(۳) قصنا بر سکّۂ زر کرد تصویر
شبیہِ حضرتِ شاہ جہانگیر
حروفِ جہانگیر واللہ اکبر
ز روز ازل در عدد شد برابر

(۴) سکّہ در شہر اگرہ زد خسروِ گیتی پناہ
شاہ نورالدّین جہانگیر ابنِ اکبر بادشاہ

(۵) از شاہِ جہانگیر بود دَور زماں
در شہر زنام اوست زر نور فشاں
"ہست نشاں ز پنج نوبت بجہاں
ایں سکّہ پنج مُہرش باد رواں

(۶) یافت در آگرہ رُوئے زر زیور
از جہانگیر شہِ اکبر

(۷) سکّہ آگرہ داد زینتِ زر
از جہانگیر شہِ اکبر

(۸) در اسفندارمذ ایں سکّہ را در آگرہ زد بر زر
شہنشاہِ زماں شاہِ جہانگیر ابن شہ اکبر

(۹) زد بزر ایں سکّہ در اجمیر شاہِ دیں پناہ

شاه نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

(۱۰) بروئے سکہ زر داد چندیں زینت و زیور
شبیہہ شاہ نُورالدّیں جہانگیر ابن شہ اکبر
زد بزر ایں سکّہ در اجمیر شاہِ دیں پناہ
شاہِ نُورالدّیں جہانگیر ابنِ اکبر بادشاہ

(۱۱) جہاں فروز در اجمیر گشت سکّہ زر
زنور نام جہانگیر شاہ شاہ اکبر

(۱۲) زنامِ شاہ جہانگیر شاہ اکبر نُور
ہمیشہ باد ابر رُوئے سکّہ لاہُور

(۱۳) بدہر باد رواں تا فلک بود در دَور
بنامِ شاہِ جہانگیر سکّہ لاہور

(۱۴) شد از لاہور در ماہ بہمن چوں مہ انور
بدورِ شاہِ نُورالدّیں جہانگیر ابن شاہ اکبر

(۱۵) بشرق و غرب مُہرِ احمد آباد
الٰہی تا جہاں باشد رواں باد

(۱۶) زرِ احمد آباد را داد زیور
جہانگیر شاہِ شہنشاہ اکبر

(۱۷) سکّہ زد در احمد آباد از عنایاتِ اِلٰہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

(۱۹) سکّہ قندھار شد دلخواہ
از جہانگیر شاہ اکبر شاہ

(۲۰) بزر ایں سکہ زد شاہِ جہانگیرِ ظفر پرتو
پس از فتح دکن آمد چو در گجرات از مانڈو

(۲۱) سکہ زد در شہر برہان پور شاہِ دیں پناہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابنِ اکبر بادشاہ

(۲۲) شہنشاہِ اکبر جہانگیر شاہ
زرو نور داد احمد آباد را

جہانگیر و نور جہاں

(۱) بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
زنامِ نور جہاں بادشاہ بیگم زر

داور بخش سنہ ۱۰۳۷ ہجری

داور بخش کا لاہور کی ضرب کا سکہ موجود ہے لیکن سبع کا کوئی نمونہ کبھی سکہ میں آیا۔

شاہ جہان سنہ ۱۰۳۷ - ۶۸ ہجری

صاحبقران ثانی کے عہد حکومت میں آگرہ اور اکبر آباد - لاہور - دہلی اور شاہجہان آباد - احمد آباد - برہان پور - سورت - ٹھٹہ - کابل - ملتان - الہ آباد - جہانگیر نگر (ڈھاکا) - اکبر نگر (راج محل) کشمیر - قندہار - جوناگڈھ - دولت آباد - اور بھکر کی ضرب کے سکے دستیاب ہوئے ہیں - ہم اس بادشاہ کے سکوں کے سبع دکھانے سے پہلے "نثار" کی اشرفی کا نمونہ دکھاتے ہیں - یہ وہ روپیہ تھا جو بطور انعام اکرام کے خیر خواہانِ ملک کو عنایت ہوتا تھا - نثار کی مہر چوکون بہت بھاری اور بڑی ہوتی تھی - اور جس حالت میں اسے علماء اور مشائخین کو عطا کرنا منظور ہوتا کلمہ وغیرہ بھی لکھا ہوتا تھا - ایسی مہر کے ایک جانب حسب

ذیل کتبہ تھا:۔

لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ

مُحَمَّدٌ

رَسُولُ اللّٰہِ ۱۰۶۴

ضرب

دارالخلافتہ شاہ جہان آباد

اسی جانب حاشیوں پر یہ عبارت خوبصورتی سے چھوٹے چھوٹے قطعوں میں نصب تھی:۔

از صدقِ ابی بکر شد ایماں انور
اِسلام قوی دست شد از عدلِ عُمر
دیں تازہ شد از شرم وحیائے عثمان
وز علمِ علی یافت ولائیت زیور

دُوسری جانب مربع کے اندر نام اور سنہ جلوس یُوں کتبہ ہوتا تھا:۔

بادشاہ غازی ۲۸

قران ثانی شاہ جہاں

جیب

شہاب الدین محمد صا

اور اِس کے چاروں طرف مفصلہ ذیل سجع تھا:۔

سِکّہ بر مہرِ دوصد مہری زد از لُطفِ اِلہ
ثانی صاحبقراں شاہِ جہانِ دیں پناہ
رُوئے زر باد از نقشِ سکّہ اش عالم فروز
تا شود از پرتوِ خورشید روشن مہر و ماہ

شاہجہان نے اپنے سکّوں پر دارالضرب شاہجہان آباد اور اکبرآباد کو دارالخلافہ اور لاہور کو دارالسلطنۃ کی ضرب سے ممتاز کیا تھا۔ اُس کے معمولی سکّوں پر جو سجع تھا اُسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

(۱) سکّۂ شاہ جہاں آباد رائج در جہاں
جاوداں بادا بنامِ ثانیٔ صاحبقراں

شاہ شجاع ۱۰۶۸ھ ہجری

شجاع کا دارالضربِ اکبرآباد کا سکّہ معائنہ میں آیا لیکن کسی پر سجع کے لکھے جانے کی خبر نہیں۔

مرادبخش ۱۰۶۸ھ ہجری

مراد کے کمبھیت اور سُورت دارالضرب کے سکّے حاصل ہوئے ہیں۔ اور ایک پر سجع بھی ہے۔

(۱) گرفت ارث ز صاحبقران شاہ جہاں
مرادبخش محمد شہ سکندر خاں

باقی دارد

محمد مشرف الحق۔ اڈنبرا

یادِ ایّامِ گذشتہ

(ترجمہ از انگریزی)

جبکہ بہارِ نوجوانی کی صبح آہستہ آہستہ شامِ عمر کی صورت اختیار کرتی ہے اور جبکہ زندگی کے قریب الاختتام ہونے پر گذشتہ سنین کا سایہ تاریک۔ اور تاریک تر ہوتا جاتا ہے تو وقت کی دوربین سے اپنے سابقہ زمانہ کے آرام اور مسرتوں پر نظر کرنا کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

اگر ہم پناہ لینے کے لئے کوئی گھر اور ایسے مہربان دل رکھتے ہوں جو ہمیں دیکھ کر باغ باغ ہوتے ہیں۔ اور اگر ہمارے آتشدانوں کے گرد مجمعِ احباب مجتمع ہے۔ تو ہمارے سفر کی سخت منزلیں شامِ زندگی کی شفق میں آسانی سے کٹ جاتی ہیں اور وہ منوّر مقامات جن میں ہو کر ہمارا گذر ہوا ہے اور زیادہ چمکدار اور خوبصورت نظر آنے لگتے ہیں۔

درحقیقت وُہ لوگ خوش نصیب ہیں جن کے مقدّس جذبات کے ترانوں کو دُنیا کے سابقہ نے متبدّل نہیں کیا۔ اور نہ اُنکے دِلوں کی اُن سرودی ہم آہنگیوں میں کوئی فرق ڈالا۔ جن کی سریلی آوازیں شامِ عمر کے ان اخیر گھنٹوں میں ایسی دلپسند۔ خوش آیند۔ اور مُوثّر معلوم ہوتی ہیں۔

جبکہ سیلانِ وقت کی رَو مَیں۔ اُس ندی کی طرح جو اپنے کنارے پر کھڑے ہوئے درخت کو نامعلوم طور سے مٹی بہا کر کمزور کر دیتی ہے۔ آہستہ آہستہ ریگِ زندگی کو ہٹا کر ہمارے سرسبز زمانہ کی قوتوں کو برباد کرنے لگتی ہیں۔ تو ہم ایک قسم کی حسرت آمیز خوشی سے اپنے اطراف کی چیزوں کو زوال پذیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اُن درختوں کو دیکھنے سے جنکے سایہ کے نیچے ہم اپنے ابتدائی برسوں میں

بیٹھتے تھے اور جن کی چھالوں پر لڑکپن کی نافہم خوشدلی میں اس اُمّید پر ہم نے اپنے نام کندہ کئے تھے کہ ہماری ہستی کی یہ ناپائدار یادگاریں زیادہ دنوں تک ہمیں زندہ رکھ سکینگی۔ اور اب انکو بھی اپنی طرح ازدیادِ عُمر سے مُرجھاتے ہوئے دیکھ کر ہمارے دلوں میں ایّامِ گذشتہ کی یاد سے تمام اندوہگین مگر خوشگوار جذبات بھڑکنے لگتے ہیں اور زمانہ آئندہ کے لئے کوئی چیز کسی امر کی پیشین گوئی کرتی ہُوئی معلوم ہوتی ہے۔

ہمارے ایّامِ خوردسالی کے متعلق (جبکہ وُہ احباب جواب ہماری طرح قبر کے کنارے پر لڑکھڑا رہے ہیں۔ یا زمانہ ہوا کہ اُس کی خاموش چھاتی پر آرام کر چکے ہیں۔ جواں مزاجی کی پُرجوش اُمنگوں کے ساتھ ہمارے گِرد مجتمع تھے) جو خیالات کہ ان ناپائیدار فنا پذیر نقوش سے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن تاریک بادلوں کے مانند ہیں جو طُوفان فرو ہونے کے بعد غروب ہوتے ہُوئے آفتاب کی رُخصتی کرنوں سے رنگین ہو جاتے ہیں۔

اگلے زمانہ کے متعلق اِس یاد میں ماضی اور مستقبل دونوں ایک جگہ ملتے ہیں۔ ہم وادیٔ شباب میں پھر واپس جاتے ہیں اور اپنے نقوشِ قدم پر جنہیں ہم نے پیچھے چھوڑا ہے نظر کرتے ہیں اور اُن آثار پر پھر ایک مرتبہ چلنا چاہتے۔ جن پر ہم اس سے پہلے چل چکے ہیں

ہم اپنے موسمِ بہار اور ریعانِ شباب کی بیفکریوں۔ شادمانیوں۔ اُمّیدوں۔ خوفوں۔ آرزوؤں اور عشرتوں کا خیال کرتے ہیں اور پھر ہمیں یہ بھی یاد آتا ہے کہ وُہ لوگ جنکے دل نہایت شادماں اور جنکی اُمّیدیں نہایت لطیف تھیں۔ کس طرح یکے بعد دیگرے موت کے ویران اور سُنسان کمروں میں گھسیٹ لئے گئے۔

وُہ لوگ جو زندگی کے موسمِ بہار میں ہمارے گِرد جمع تھے اور جو جوانی کے خوشگوار سفر میں ہمارے ساتھ رہے۔ شائد سب کے سب ہم سے جُدا ہو گئے اور ہر ایک نے اپنے منزلِ مقصُود کی طرف ایک جُداگانہ راہ اختیار کی۔

یہ مفارقت اُن لوگوں سے جن سے ہم اس سے پہلے کبھی جُدا نہ ہُوئے تھے۔

آخری رخصت ہوگئی - ہم اُنکے ہاتھوں کے دباؤ اور پُر اُمید و رنج شکلوں کو یاد کرتے ہیں اور اُن کی اُس اندوہگین آواز کو بھی - جس کے لہجہ کی نسبت اب ہمیں خیال آتا ہے کہ اُس میں ضرور کوئی چیز پیشین گوئی کر رہی تھی کہ اب ہم پھر اس دُنیا میں دوبارہ نہ ملینگے -

وُہ اجنبی ملکوں میں چلے گئے اور بیگانہ سرزمینوں میں جاکر بیگانہ ہوگئے - بدبختی اور مصائب کی اذیتیں برداشت کیں اور آخرکار غیروں کی توجّہ اور محنت سے خوابگاہِ لحد میں آرام پایا -

جب ہم ان دوستوں کی مَوت کی خبر سُنتے ہیں اور جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وُہ لوگ جن سے ہم اور جو ہم سے محبّت کرتے تھے کس طرح موت کی گھاٹی میں ہم سے پہلے چلے گئے اور زمین کے سینہ پر ایسے بیخبر سوئے ہیں کہ پھر اُن ہزارہا لُطف و عنایات کو جنہوں نے اندر ہی اندر ہمارے دلوں کے گرد زخم ڈال کر امتدادِ زمانہ کے ساتھ ناسُور پیدا کر دیئے ہیں - اور جو کہ بمشکل ہمارے درمیانی تعلقاتِ زندگی کو منقطع کئے بغیر مفقود اور از یاد رفتہ ہو رہی ہیں - دوبارہ تازہ کرنے کے لئے بیدار نہ ہونگے - تو ہم اپنے دِل میں انکے حِلم انکی معافیوں اور اپنی طرف انکی نوازشات کا خیال کرتے ہیں - اور ساتھ ہی اس کے ہمیں اپنے غرور - اپنے کینہ توز خیالات اور انکی نسبت اپنی بدمزاجیاں یاد آتی ہیں -

مگر اب ہمارا پچھتانا بعد از وقت ہے - ہمارے رنج بیکار اور ہمارے آنسو غیر موثر ہیں - اُنکا شعلۂ وجود خاموش - اور اُنکی شمع حیات گُل ہو چکی ہے اور اب وُہ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو کر اُس سرزمین میں جا بسے ہیں جہاں رُوحیں سکونت پذیر ہوتی ہیں

عزیز محمد خان سکرٹری محبوب کلب - پربھنی - دکن -

وقت

پُرانے زمانے کا ایک شاعر جو اس دنیا سے سخت بیزار تھا اور جسے اس کی کوئی چیز پسند نہ آتی تھی۔ کرۂ زمین کی نسبت لکھتا ہے "اسکا بہت سا حصّہ تو سمندر نے گھیرا ہُوا ہے۔ جو باقی رہا اُس میں سے بہت سی جگہ پہاڑوں نے سنبھال لی ہے۔ کچھ ریت نے ہتھیا لیا ہے۔ بعض جگہ سُورج کی جلا دینے والی شعاعیں ناک میں دم کرتی ہیں اور بعض جگہ اس کثرت سے برف پڑتی ہے کہ زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔ الغرض بہت ہی تھوڑا حصّہ ایسا باقی رہتا ہے جہاں آدمی اپنی زندگی کے چار دن امن چین سے گذارے"

اِس شاعر کا یہ قول زمین کے متعلق تو خواہ کچھ بھی وقعت رکھتا۔ مگر ہاں البتّہ وقت پر خوب عائد ہو سکتا ہے۔ مثلاً۔ ہمارا بہت سا وقت تو سونے میں چلا جاتا ہے۔ کچھ ان ضروریات کے پُورا کرنے میں جو قُدرت نے ہمارے ذمّہ ڈالدی ہیں صرف ہوتا ہے۔ جو باقی بچتا ہے اس میں سے کچھ حصّہ رسم و رواج کے ادا کرنے میں لگانا پڑتا ہے۔ مثلاً زندگی کے ظاہری عیش کے سامان مہیّا کرنے میں دُوسروں کے ساتھ ملنے جلنے میں۔ اب تمام چیزوں سے جو بچ رہتا ہے اس میں سے کچھ بیماری کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ اور بہت کچھ کاہلی و سُستی کی بھینٹ چڑھتا ہے۔ الغرض وقت کا وُہ حصّہ جسکا ہم اپنے آپ کو مالک سمجھ سکیں اور جسے ہم جہاں چاہیں خرچ کر سکیں۔ بہت ہی تھوڑا رہ جاتا ہے۔ اس قلیل حصّہ وقت کو بھی ہم احتیاط سے نہیں برتتے اور روزمرّہ بہت سا معمولی کاموں میں لگا دیتے ہیں۔ اور ہماری زندگی کا اکثر حصّہ صرف اس کوشش میں گذر جاتا ہے کہ ہم اپنی باقی زندگی آرام سے گذاریں۔

اب چاہیئے یہ کہ اس حصّہ وقت کو جو ہمارے لئے بچتا ہے ہم کفایت شعاری سے

برتیں اور جتنا وقت کسی کام میں صرف کریں اُس سے اتنا ہی بلکہ زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔ جیسا کہ زمین کا وُہ حصہ جو پہاڑوں اور سمندر وغیرہ سے بچ رہتا ہے اپنے تمام باشندوں کے رہنے کے لئے کافی ہے اور اُس میں اتنی پیداوار ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے کہ تمام اہل زمین اگر عمر بھر اِسے کھاتے رہیں تو بھی بچ رہے۔ مگر ہم اپنے وقت کی قلت کی ہمیشہ شکائیت کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں وقت کی اتنی ضرورت نہیں جتنی استقلال اور ثابت قدمی کی ہے۔ کیونکہ باوجود وقت کی قلت کے شاکی ہونے کے ہم کچھ کرتے بھی نہیں۔ اپنی تمام زندگی یُونہی بیفائدہ لہو ولعب میں گذر جانے دیتے ہیں کبھی یہ خیال نہیں کرتے کہ ہمارے پاس ایک کام کے لیئے کافی وقت ہے۔ اِس لئے معمولی باتوں میں مشغول رہتے ہیں۔ تھوڑے سے وقت کی تو کچھ پرواہ ہی نہیں۔ بلکہ پانچ دس منٹ کے ضائع ہو جانیکا تو خیال کرنا فعل عبث سمجھا جاتا ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ (یا تو قدرت کی طرف سے ہم میں یہ بات ودیعت رکھدی گئی ہے یا عادت کا اثر ہے) کسی بڑی چیز کا اگر اندازہ لگانا ہو تو ہم اُس کے چھوٹے چھوٹے حِصّوں کا علیحدہ علیحدہ اندازہ لگاتے ہیں۔ اور اگر کسی قلیل المقدار چیز کی ماہیت یا قیمت ہم معلوم کرنی چاہیں تو ہم اُس کے چھوٹے چھوٹے حصّوں کو یکجا کرکے اس نتیجہ کو پہنچتے ہیں۔ مثلاً ہم نے وقت کے بڑے حصّوں کو صدیوں اور سالوں پر منقسم کیا ہے۔ تاکہ کچھ اندازہ تو لگا سکیں۔ اب اسی قاعدہ کے مطابق اگر ہم چند ایک منٹوں کی پُوری پُوری قدر کرنی چاہیں تو ہمیں انکو یکجا کرکے یعنے اُن کے دِن اور ہفتے بنا کر دیکھنا چاہئیے۔ اس طرح کرنے سے ہم اچھی طرح معلوم کر لینگے کہ جو وقت ہم تھوڑا سا سمجھکر ضائع کر دیتے ہیں۔ حقیقت میں قابل قدر چیز ہے اور سوچ سمجھکر برتنا چاہئیے۔

داناؤں کا قول ہے کہ اگر تم پیسہ بھی خرچنے لگے ہو تو پہلے سوچ لو کہ آیا کسی ضروری چیز پر خرچ کرتے ہو یا نہیں۔ یہ ہرگز نہ خیال کرو کہ ایک پیسہ کی کچھ حقیقت ہی نہیں۔ کیونکہ

لاکھوں روپے پیسہ پیسہ ہی ہو کر خرچ ہو جاتے ہیں۔ اسوقت ہم یہ خیال نہیں کرتے کہ اس جگہ خرچ کرنے سے کچھ حاصل بھی ہے یا نہیں مگر اخیر میں حساب کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ اتنے سو روپے اُٹھ گئے۔ بعینہٖ یہی حال وقت کے صرف کرنے کا ہوتا ہے۔ مثلاً جتنے منٹ ہم روز بیفائدہ ضائع کرتے ہیں اور اُن میں بعض اوقات محض لایعنی بکواس کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ اُنہیں اگر جمع کیا جائے تو خاصہ اتنا بڑا حصۂ وقت بنجاتا ہے کہ بعض لوگوں کی زندگی کے دنوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ حصہ خود ہماری زندگی میں ایزاد کر دیا جائے تو ہم تھوڑے خوش نہ ہوں۔ مگر ہم خود اپنے پیروں پر دیدہ و دانستہ کلہاڑی مارتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ کیا ہی تعجب خیز بات ہے؟

ہمیں چاہیے کہ اگر ہم اپنے زندگی کے آخری دِن آرام سے گذارنے چاہتے ہیں تو ہم آجکل وقت کے صرف کرنے میں احتیاط برتیں اور منٹ تو کیا منٹ کا چھوٹے سے چھوٹا حصّہ بھی غیر مفید باتوں میں خرچ نہ کریں۔ کیونکہ آدمی کو زندگی کے اخیر میں بہت سی ایسی باتیں یاد آتی ہیں جو اُس نے نہیں کی ہوتیں اور جنہیں یاد کر کے وُہ کفِ افسوس ملتا ہے۔ مگر بعد از وقت۔ اطالیہ کے ایک فلاسفر نے اپنا اصُول یہ قرار دیا ہُوا تھا کہ وقت میرے لئے بمنزلہ اراضی کے ہے۔ جنمیں اگر محنت سے کاشت کیجائے تو ہمیشہ زمیندار کو فائدہ ہی ہوتا ہے۔ اور اس کی محنت بہت اچھی وصُول ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ اس اراضی کا کوئی حصّہ بھی غیر مزروعہ نہ چھوڑا جائے اور احتیاط سب حصّوں کی یکساں ہو۔

پنڈت من موہن ناتھ رازدان

ٹوپی

آج کل جو بعض نہایت اہم مسئلے ہندوستان میں اہل الرائے حضرات کے درپیش ہیں۔ اُن میں ایک یہ مسئلہ ٹوپی کا ہے۔ قانونِ رازداری۔ قانونِ اصلاحِ تعلیم۔ تقسیمِ بنگالہ۔ یہ سب ضروری مبحث ہیں۔ مگر ٹوپی کسی سے کم نہیں۔ وُہ مسائل تو محدود حلقوں پر اثر رکھتے ہیں۔ اِس کا اثر عام ہے۔ ممکن ہے آپ نے نہ سُنا ہو کہ ٹوپی کا مسئلہ نہایت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ مگر آپ کے نہ سُننے سے کچھ اس کی اہمیت میں فرق نہیں آتا۔ یہ سب مسئلوں کے سرپہ ہے۔ اِسی کا آج کل راج ہے۔ پگڑی بیچاری اس کے مقابلے میں گر گئی ہے۔ چند دُور اندیش خیر خواہانِ مُلک جانتے ہیں کہ ہندوستان کے لئے پگڑی ضروری ہے۔ خدا وُہ دِن نہ دکھائے کہ اِس کی پگڑی اُتر جائے۔ مگر لوگ انہیں دقیانوسی سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں:— کہ دستار جز پیچ بر پیچ نیست

بر عاقلاں جُز گلہ ہیچ نیست

کیوں نہ ہو۔ سعدی سے بھی خوب کام لیا۔ اگر آج شیخ شیرازی زندہ ہوتا تو داد دیتا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ گلستاں کے لئے بھی بعض اور کتابوں کی طرح تحریف کی ضرورت پڑیگی۔ غرض ٹوپی کی طرفداری میں ہر طرح کے ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر ٹوپی ہے کہ عقدۂ لاینحل بنی ہوئی ہے۔ دانایانِ فرنگ نے مُدتیں ہوئیں اپنے ہاں اس مسئلہ کو حل کر لیا۔ اور اپنے ملک کی آب و ہوا اور ضروریات کے موافق ایک وضع ٹوپی کی قائم کر لی۔ اُس دِن سے سارا یورپ ٹوپی پوش ہے۔ اگر تھوڑی تھوڑی تبدیلی مختلف ممالک کی ٹوپیوں کی وضع میں ہے۔ تو وُہ جُزوی۔ اصُول سب جگہ ایک ہے۔ اس کا کام سر کو سردی اور گرمی سے بچانا اور آنکھوں کے سامنے سایہ رکھنا اور ان کو آفتاب کی

شعاعوں سے بچاتا ہے۔ گویا ٹوپی میں بھی حکمت ہے۔ معلوم نہیں یہ حکمت اُس ٹوپی کی جبلّی ہے یا حکیموں کے سروں پر رہتے رہتے اِس میں سرایت کر گئی ہے۔ مگر اِس میں شک نہیں کہ اہل فرنگ کی ٹوپی ایک دانا ٹوپی ہے اور گو باعتبارِ صورتِ ظاہری وُہ حسن کا دعوے نہیں کر سکتی۔ مگر حُسنِ باطن سے خوب آراستہ ہے۔ تُرکوں نے بھی جو یورپ میں آباد ہیں۔ ٹوپی کے مسئلے سے عرصہ ہوا فراغت پالی ہے۔ اُنہوں نے ایک رنگ اختیار کیا ہے۔ جو ساری قوم میں مقبول ہو۔ وضع قطع تراش خراش میں تُرکی ٹوپی جسے فیز یا طربوش بھی کہتے ہیں۔ ٹوپیوں میں ایسی ہی ممتاز ہے۔ جیسے تُرک باعتبار جسم اور قوے کے انسانوں میں۔ اِس کا موزون سُرخ یا سیاہی مائل رنگ اِس کی نرم نرم بانات۔ اس کی لچک۔ اِس کی سہولت۔ اور سب سے بڑھ کر اس کا لٹکتا ہوا پھندنا۔ دل فریب ہیں۔ اور تُرکوں کے سُرخ و سپید چہرے پر تو یہ وُہ بہار دیتی ہے۔ کہ العظمۃ للہ۔ مگر باعتبار فوائد کے یہ جہاں ایجاد ہوئی ہے وہاں کے لئے موزون ہو تو ہو۔ مگر ایسے مُلک کے لئے جن میں انتہا درجے کی گرمی یا انتہا درجے کی سردی پڑتی ہو۔ یا باری باری دونوں موسم آتے ہوں۔ ناقص ہے۔ ایرانیوں کے ہاں بھی اپنا قومی شعار موجود ہے اور ایک انداز خاص ٹوپی کا موجود ہے۔ مگر واہ رے ہندوستان۔ اُونٹ کی طرح کوئی کل بھی توسیدھی نہیں۔ اہلِ مُلک کو نہ سر کی ہوش نہ پاؤں کی۔ بنگالی ہیں کہ ننگے سر پھرتے ہیں۔ اور مدراسی ہیں کہ ننگے پاؤں۔ بنگالی اگر ٹوپی پہننے کا تکلف فرمائینگے بھی تو برائے نام۔ وہاں سے چلئے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کو لیجئے۔ گرمی ہو یا سردی تمام پُرانے لوگ ایک چھ ماشے کی ٹوپی پہنینگے جو ہوا سے اُڑ جائے۔ کوئی خاص تقریب ہوئی۔ یا میلا ٹھیلا ہوا تو لیس کی اوڑھنے لگے۔ اِس سے ترقی کی تو سلمے ستارے کی نوبت آئی۔ اب یہاں تفرقہ شروع ہوا۔ نئی پود کا اور لباس اور پُرانی کا اور۔ پھر ایک تفریق ثانی۔ ہندوؤں کی

اور ٹوپی۔ مسلمانوں کی اور۔ پھر آگے مسلمانوں میں اور تفریق۔ ٹوپی وہ نیرنگی دکھاتی ہے۔ کہ اگر کسی بڑے مجمع یا میلے یا تماشے میں لوگوں کی تصویر لیجائے۔ اور ٹوپیوں کے جتنے نمونے وہاں موجود ہوں انکو جمع کیا جائے تو سنٹ لوئس کی آیندہ نمائش کے لئے ایک خاصہ محکمہ ٹوپیوں کا قائم ہو سکتا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں یہ توقع رکھنا کہ یہ نازک مسئلہ کبھی پوری طرح حل ہوگا اور سارے اہل ہند کے لباس میں یکرنگی آجائیگی محال کی توقع رکھنا ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ ایسی یکرنگی قومیت کے لئے ضروری ہے۔ مگر کم ازکم یہ تو ہو کہ ہندوؤں میں سب ایک ٹوپی پر اور مسلمانوں میں سب ایک ٹوپی پر رفتہ رفتہ متفق ہو جائیں۔ مسلمانوں میں ترکی ٹوپی پھیلتی جاتی ہے۔ اور بمقابلہ اور نمونوں کے حق بھی رکھتی ہے کہ پھیلے۔ مگر ابھی وہ وقت دور ہے۔ کہ یہ حکمی طور پر سب کے سر پر نظر آئے۔ آپ اگر اس کی مشکلات سے آگاہ نہیں۔ تو لیجئے سنئے۔ بہت لوگ اس کے دشمن ہیں۔ بعض نازک دماغ ہیں۔ جنہیں اس ٹوپی سے نیچریت کی بو آتی ہے۔ بظاہر ٹوپی ایک بے زبان۔ بیگناہ چیز ہے۔ مگر ہمارے ملک میں اگر اسے خاص اثرات حاصل ہو گئے ہیں۔ یہ انسان کے دل کو بدل سکتی ہے۔ عقائد میں خلل ڈال سکتی ہے۔ اسے پہنا اور نیچری ہونے کا تمغا حاصل کیا۔ ایک حصہ حکام کا ایسا ہے جو اس ٹوپی کو ہیوفا سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے اس کی ظاہری سیدھی سادی صورت پر نہ جاؤ۔ اس میں بڑی بڑی شرارتیں پنہاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جس نے ترکی ٹوپی پہن لی وہ فوراً ترک ہی بن گیا۔ اور ترکوں سے اور اہل فرنگ سے چشمک کچھ آج کی نہیں۔ مگر با ایں ہمہ یہ چپکے چپکے دلوں میں گھر کرتی جاتی ہے اور جہاں کئی اشخاص اس کے روز افزوں استعمال کو گھبراہٹ سے دیکھتے ہیں۔ وہیں بہت سی نگاہیں ترکی ٹوپی کی طرف امید دل کے ساتھ اٹھتی ہیں۔ کہ یہ کچھ کر کے دکھائیگی۔ ترکی ٹوپی میں صرف ایک عیب ہے۔ ذرا مسجد میں کم جاتی ہے۔ اور اگر جائے تو دوسری ٹوپیاں اور عمامے اسے کم نگاہی

سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کی کامیابی اسی میں ہے کہ یہ ہر مقام کی سیر کرے۔ یہی نہیں کہ صرف بڑے بڑے انگریزی طرز کے جلسوں کے سٹیج پر ہی اپنے پھندنے کی نمائش میں مصروف رہے۔ یا صرف سینہ تان کے بیٹھنے والوں کے مجمع کی زیب ہو۔ بلکہ خانہائے خدا میں بھی پہنچے جن میں داخل ہونے والوں کے سر نیاز زمین پر دھرے ہوتے ہیں۔

ہم ہی میں بعض لوگ ہیں جو انگریزی ٹوپی کے حسنِ باطنی اور فوائد پر مٹے ہوئے ہیں۔ اس بات کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ صورت پرستی کے رہگزرِ عام سے نکل کر سیرت پرستی کی منزلِ خاص تک پہنچے ہیں۔ مگر سب یکساں نہیں۔ بعض صرف اس لئے وہ ٹوپی پہننا چاہتے ہیں۔ کہ وہ صاحب لوگوں میں شمار ہوں۔ یہ صورت پرستی کا ایک ادنےٰ نمونہ ہے اور قابلِ حقارت۔ مَیں نے دیکھا کہ ایسے صاحبوں کی بہاری بھرکم ہیٹ پر وہ ہماری پرانی دقیانوسی چھ ماشے کی ٹوپی بھی ہنستی ہے۔ اسی طرح مَیں اُن شخصوں سے بمشکل متفق ہو سکتا ہوں جو انگریزی ٹوپی کو سفر میں پروانۂ راہداری بناتے ہیں۔ اُنکی انگریزی ٹوپی گویا زمانہ ساز ٹوپی ہے۔ مَیں نے اکثر اپنے ہموطنوں سے جنہیں اس مُلک میں سیاحت کا اتفاق ہوا ہے سُنا ہے کہ آدمی اوّل یا دوم درجہ کی گاڑی میں سفر کرنے کے مصارف برداشت کر کے بھی آرام نہیں پا سکتا تاوقتیکہ لباس سے کم از کم کرسٹان نہ معلوم ہو۔ اور اس لئے وہ بلا تامّل سفر کو روانہ ہوتے وقت انگریزی ٹوپی سر پر دے لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہیں اس صورت میں ریل کے مُلازموں سے کام لینے میں قدرے سہولت ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی صاحب لوگ ہم سفر ہوں تو اُن سے بھی جھگڑے کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ مگر اس آسائش کی اُمّید پر وہ انگریزی ٹوپی کی عزّت بڑھاتے اور اپنی ذاتی اور قومی عزّت گھٹاتے ہیں۔ گویا اس کے یہ معنے ہیں کہ اُنکے وہ معزز بھائی جو اپنے مُلک کا لباس پہنتے ہیں۔ اور جو اُس کے ساتھ اگر چاہیں بھی تو انگریزی ٹوپی بغیر مضحکہ اُڑوانے کے نہیں پہن سکتے۔ ہمیشہ ریل کے سفر میں بے پروائی کی نظر سے دیکھی

جائیں۔ اور وُہ صرف اپنی فوری ضرورت کے وقت کو ٹال لیں۔ وُہ عزّت کیا ہے جو آپ کو اِس لئے ملے کہ دُوسرا شخص آپ کو وُہ نہیں سمجھتا جو آپ فی الحقیقت ہیں۔ بلکہ کسی اَور کے دھوکے میں آپ کی عزّت کرتا ہے۔ عزّت وُہ ہے جو آپ کی اپنی مستقل ٹوپی کی ہو۔ نہ کہ مانگی ہُوئی عارضی ٹوپی کی۔ ہماری سعی یہ ہونی چاہیئے کہ ہم متفقہ طَور پر ایک ٹوپی پسند کریں۔ اور اُسے اپنا مُلکی اور قومی شعار بنائیں۔ جس سے جہاں جائیں پہچانے جاسکیں اور پھر اس کوشش میں ہمہ تن مصروف ہوں کہ وُہ ٹوپی اتنی قابلِ عزّت و وقعت ہوجائے کہ جو اُسے دیکھے پُکار اُٹھے کہ یہ ایک معزّز قوم کا فرد آرہا ہے۔ ٹوپی مشرقی ممالک میں ایک نشانِ عزّت ہے۔ اِسے پُوری طرح معزز بنانا چاہیئے +

اِکرام

چار تصویریں۔ آج ہمارے چار نوجوان مضمون نگاروں کی "کارڈ سائز" تصویریں ایک ہی صفحہ پر اکٹھی چھپتی ہیں۔ ان کے ناموں سے ہمارے ناظرین خوب واقف ہیں۔ مشتاق احمد صاحب زاہدی اور مرزا محمد سعید صاحب کو خاک پاک دہلی سے نسبت ہے اور دونوں مستعد اور قلم برداشتہ لکھنے والے۔ ہونہار مضمون نگار ہیں۔ جن کے مضامین نہ صرف مخزن میں شائع ہوتے ہیں بلکہ اَور کئی رسالوں کے اوراق کی زینت ہیں۔ شیخ محمد اکرام صاحب۔ جنکا ایک اچھوتا مضمون اوپر درج ہے۔ صرف مخزن کے لئے لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں مگر کبھی کبھی۔ کیونکہ انکی مستقل خدمت ایڈیٹری میں امداد اور رسالے کے متعلق خط و کتابت وغیرہ ہے۔ یہ تینوں اصحاب پنجاب یونیورسٹی کی امتحان بی۔ اے سے فارغ ہوچکے ہیں۔ خُدا کرے ہم انہیں جلد کامیابی پر مبارکباد دیسکیں۔ چوتھے صاحب جو اس مجمع میں تشریف رکھتے ہیں منشی دیانرائن صاحب نگم ہیں جو سالگذشتہ میں الٰہ آباد یونیورسٹی کی ڈگری لے چکے ہیں اور طالب علمی کی اوقات فرصت میں جو مشقِ تحریر ہم پہنچائی تھی۔ اُس سے مفید علمی کام لے رہے ہیں۔ رسالہ زمانہ بریلی میں انکی حُسن ترتیب اور خوبی تحریر نے ایک نئی روح پھونکدی ہے اور وہ ایک اچھا ماہوار رسالہ ہوگیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ منشی صاحب اپنی عمر علمی مشاغل میں صرف کرینگے۔ کیونکہ اُس کی صلاحیت انکی طبیعت میں موجود ہے۔

گنجِ تنہائی کا ایک شاعر

جنگل میں سینکڑوں خوشنما پھول کھلتے ہیں اور مُرجھا جاتے ہیں۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اس دُنیا میں بہت سے لائق لوگ بغیر کسی خاص شہرت کے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اپنی ترقی کے عالمِ شباب میں مرجاتے ہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں کی تلاش ہے اور ہماری خواہش ہے کہ اُنکی شہرت باقی رہے۔ اُردو زبان کا نہایت جادو بیان اور قابلِ قدر شاعر میرٹھ میں دفن ہے۔ ہم اس کے نہایت مختصر حالات اور اس کے کلام کا ایک قلیل انتخاب آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ سیّد محمّد مُرتضےٰ صاحب بیان و یزدانی نے تقریباً چالیس برس کے سن میں ۱۳ مارچ سنہ ۱۹۰۰ء کو اُردو زبان کی شاعری کی صدر نشینی چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے تنہائی اختیار کی۔ آپ کے آٹھ بھائی ہیں۔ آپ کے اور بھائی معزز عہدوں پر ہیں۔ مگر حضرت بیان کو شاعری سے خاص مناسبت تھی۔ اس لئے آپ اسی عالم کے بادشاہ ہُوئے اور اپنے کلام میں ایسی رنگینی۔ اور وُہ زور دکھلا گئے ہیں کہ پڑھنے والا ایسے شاعر کی وفات پر افسوس کریگا۔ حضرت بیان کا دیوان ان کے بڑے بھائی سیّد اصغر حسن صاحب مرتّب کر رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ وُہ انکا صرف حقانی کلام انتخاب کر رہے ہیں۔ آپ کا دم اُردو زبان کے لئے بہت غنیمت تھا۔ اُردو شاعری کی حالت پر کیا اچھا فرما گئے ہیں :-

وُہ رخصت ہُوئے۔ جنکی تو لاڈلی تھی
وُہ مرمِٹ گئے۔ جنکی نازوں پلی تھی
کٹے وُہ گلے جن کی چمپا کلی تھی
مٹے وُہ چمن جن میں پھُولی پھلی تھی
مٹی بادشاہت نیا دَور ہے اب

زمین اور ہے آسماں اور ہے اب

تری دھوم شاہوں کے دربار میں تھی
طلب بادشاہوں کی سرکار میں تھی
ہر اک جشنِ شادی میں تہوار میں تھی
کہ برقی کشش تیرے ہر تار میں تھی
بس اب من چلو چھوڑ دو اس چلن کو
کہ پلٹا ہے دُنیا نے اِک اک فشن کو
دیا رنگ نیچر نے کیا کیا سخن کو
بدل دو نئے سر سے طرزِ کہن کو
تکلف کی بیکار زرتاریاں ہیں
کہاں گل کی اچکن میں گلکاریاں ہیں

ایک جگہ اپنے ایک عزیز کو لندن رخصت کرتے وقت یُوں فرماتے ہیں :-

مُبارک ہو لندن کے اوجانے والے
پہاڑوں کی چوٹی کو ٹھکرانے والے
سمندر کی لہروں میں لہرانے والے
جہازوں سے چڑھکر اُتر آنے والے
ہر اِک بحر سے پار بیڑا تیرا ہو
خدا کی عنایت تیری ناخُدا ہو

مہ آسماں جاہِ اسلام رہنا
نہ چھپنا ترا استرہ ہو نہ گہنا
نہ بننا کسی بُت کی گردن کا گہنا
رہے تجھ کو نورِ الٰہی سے لہنا
سمجھتا ہے خوبی میں یُوسف زمانہ
کہیں بھائی لندن میں کھو نہ جانا

نیچرل شاعری کے لئے آپ کی فطرت بہت عمدہ تھی۔ اُمید کو مخاطب کرکے یُوں کہتے ہیں :-

ہر اک فرقہ میں پیشوا بن گئی تو
ہر اِک وضع میں خوشنما بن گئی تو
خُدا جانے بس کیا سے کیا بن گئی تو
کلیسا میں بُت کی ادا بن گئی تو
حرم میں پہنچکر ادا بن گئی تو

بھروسہ کیا ہے ترا بیکسوں نے کیا تجھ پہ تکیہ مصیبت زدوں نے
ٹھکانا بنایا تجھے بے گھروں نے لگائی ہے لو تجھ سے اُجڑے ہوؤں نے
اندھیرے گھروں کا دیا بن گئی تو

آپ کی نثر میں عجیب رنگ پایا جاتا ہے۔ مَیں حیرت میں ہوں کہ یہ شاعر کس بلا کی طبیعت کا تھا۔ "باغِ اِرم" ایک مضمون لکھا تھا اس میں بعض جگہ اپنے اشعار سے ایسی جان ڈالی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ ایک موقعہ پر اِسی مضمون میں یُوں فرماتے ہیں:۔

لالہ بھی جلتا تھا میرا داغِ سوزاں دیکھکر نوک کی لیتا تھا کانٹا تن کو عریاں دیکھکر
اوس بھی دیتی تھی چھینٹے مجھکو گریاں دیکھکر گُل بھی ہنستا تھا مرا چاکِ گریباں دیکھکر

دُوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

عشوۂ صیّاد بازی لے گیا شہباز سے جاگتے آتے تھے فتنے پاؤں کی آواز سے
زُلف نے کیا جانے کیا جُھک کر کہا دمساز سے خود بخود پہلو میں آ بیٹھا کچھ ایسے ناز سے

سالِ نو پر آپ فرماتے ہیں:۔

بادِ بہاری جم جم آئی جم جم آئی جھم جھم آئی
دُھوم مچی متوالی گھٹا میں بجلی ناچی کالی گھٹا میں
بجلی ناچ دکھاتی آئی چڑیا منگل گاتی آئی
رُوپ ہے پھُول کی لالی پر مُتری ہے زہرہ ڈالی پر

معراج کا حال نہایت خُوبی سے بیان کیا ہے۔ اِسوقت تین شعر یاد ہیں۔ وُہ یہ ہیں:۔

دُرِ مصطفےٰ سنگِ مُوسےٰ نہیں ہے کہ یہ عرش ہے طُورِ سینا نہیں ہے
چلو وادیِ عشق میں پا برہنہ یہ جنگل وُہ ہے جس میں کانٹا نہیں ہے
بیاں کیا کروں سیرِ اَسریٰ کی باتیں خدا جانے کیا بات ہے کیا نہیں ہے

سر سیّد کا مرثیہ نہایت دردناک انداز سے لکھا ہے - ہر لفظ سے حسرت و یاس کی آواز آتی ہے - اس کے چند اشعار یہ ہیں :-

قہر ہے سر سیّد احمد خاں بہادر کی وفات
وُہ زمیں کا فخر جورِ آسماں سے اُٹھ گیا

راج تیرا لُٹ گیا اے قوم اے حرماں نصیب
تیرے سر کا تاج تختِ عز و شاں سے اُٹھ گیا

وُہ عمادِ مملکت تھا وہ ستُونِ سلطنت
ہائے قیصر قیصرِ ہندوستاں سے اُٹھ گیا

ہائے جس نے ڈالدی تھی قوم کے مُردے میں جان
وُہ مسیحا دستِ مرگِ ناگہاں سے اُٹھ گیا

اے دلِ نالاں جرس بن اے جرس فریاد کر
کارواں سالارِ ملّت کارواں سے اُٹھ گیا

اے علی گڑھ تیرے ویرانوں کو اب دیکھیگا کون
خانہ آرائے ترقی خانماں سے اُٹھ گیا

جب دیا کاندھا جنازے کو ہوئی بیتاب قوم
دھڑ تڑپتا رہ گیا اور سر جہاں سے اُٹھ گیا

شعر کیسے نظم کِس کی نالہ کیا فریاد کون
شعلۂ آتش دلِ گرمِ بیاں سے اُٹھ گیا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بیاؔن کی طبیعت گذشتہ اور موجودہ دونوں طرز کی شاعری کے لئے موزون تھی - میں اُنکی قابلیّت کا دِلی مدّاح ہُوں - لسان الملک اور طوطی ہند کے پچھلے پرچے قابلِ دید ہیں - ان میں حضرت بیاؔن کی نظم و نثر کا رنگ معلوم ہوتا ہے - آپ کے شاگردوں میں بہت سے قابل اور معزّز صاحب ہیں - افسوس ہے اُن کو اُن کے کلام کا کچھ خیال نہیں - ہمیں ان چند صاحبوں سے واقفیت حاصل ہو - اُمّید ہے کہ یہ حضرات مرحوم کے بھائی کو پُورا الکلام چھپوانے پر مجبور کرینگے

بالسروپ صاحب شکن - احمد جان صاحب تبسّم - نور الحسن صاحب یاس اور اختر خیر نگر میرٹھ

شاہ محمد نذیر ہاشمی غازی پوری

دیہات اور شہر کی زندگی کا مقابلہ

یُوں تو اس عنوان پر بہت سے مضمون لکھے گئے۔ مگر اُن میں سے تقریباً سب کے سب دیہاتی زندگی کے دلفریب منظروں کو بیان کرتے ہیں۔ میرا مقصد اس مضمون کے لکھنے سے یہ دکھانا ہے کہ دیہات اور شہر کی زندگی کا اثر انسان کے اندرونی قویٰ اور خصوصاً دماغ کی نشو ونما پر کیسا پڑتا ہے۔ اسکا ماخذ سمائلز کی ایک کتاب ہے۔

یہ ضروری امر نہیں ہے کہ بڑے شہر بڑے ہی آدمی پیدا کیا کریں۔ بلکہ برعکس اسکے شہری زندگی کا خاصہ چھوٹے آدمی پیدا کرنا ہے۔ کاروبار کی مصروفیت اور بیفکری کے کھیل دماغ کو نمو سے روکتے ہیں۔ آدمی کا دماغ شہر میں ہر ایک طرح کی چیز دیکھتا ہے، مگر اس کا اثر باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ ایک چیز کا خیال دُوسری کے خیال کو فوراً مٹا دیتا ہے۔

ایک بچہ جو دیہات میں پیدا ہوا ہے آہستہ آہستہ نشو ونما پاتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ بچہ جو شہر میں پیدا ہوتا ہے وقت مقررہ سے پہلے ہی جوان ہو جاتا ہے۔

شہری زندگی دماغی کاموں کی دشمن ہے۔ اس میں کام تو بہت ہے اور آرام تھوڑا۔ شہری زندگی کا تمام روزانہ کام یہ ہے۔ دن بھر کاروبار میں مصروف رہے۔ شام ہوتے سیر سپاٹے کو نکلے۔ رات کو اگر مطالعہ کے شوقین ہوئے تو کوئی اخبار یا کتاب دیکھی۔ نہیں تو گنجفہ۔ چوسر کھیلی یا تھیٹر کا تماشا دیکھا۔ رات کو پڑ کے سو رہے۔ صبح اُٹھے تو پھر وہی چکی پیسنی۔ اب بھلا بتایئے کہ اس انضباط

اوقات میں ایسا کونسا وقت ہی جب آدمی قدرت کی دلچسپیوں یا اپنے ہمجنسوں کے خصائص کو مشاہدہ کر کے اُن سے تجربہ حاصل کرے اور فائدہ اُٹھائے۔ ڈاکٹر گرڈی نے لندن میں رہ کر دیہات اور شہر دونوں جگہ کے نوجوان لوگوں سے مُلاقات کی اور وہ اپنے اس تجربہ کا نتیجہ اپنی سوانح عمری میں اِس طرح بیان کرتے ہیں۔ "میں نے انگریزی تعلیم کے نقائص کو اُسوقت خوب مشاہدہ کیا جب میں لنڈن میں تھا۔ شہر کے تعلیم یافتہ لوگ اپنے اپنے کام میں تو خوب مشاق ہوتے ہیں مگر اِس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔"

کارلائل حقارت سے لکھتا ہے "تمام لوگ جو لنڈن کی پیداش ہیں۔ تنگ دل ناقص انسان ہوتے ہیں بلکہ یُوں کہو کہ پُورے انسان نہیں۔ انسانوں کی کسر ہوتے ہیں"۔ انگلستان کے تمام اولوالعزم لوگوں کی پیدائش دیہات میں ہُوئی اور وہیں انہوں نے پرورش پائی۔ شہر کا ایک نوجوان ایک کثیر التعداد آدمیوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ اُس کے ہمسائہ اُسکو نہیں جانتے اور وہ انہیں نہیں جانتا۔ اور بشرطیکہ اُس کی ضروریات پُوری کرنے کے لئے اس کے پاس کافی ذرائع ہوں۔ وُہ ترقی کرنے کی بالکل کوشش نہیں کرتا۔

اگرچہ وہ اشیا جو ایک دیہاتی لڑکے کے سامنے آتی ہیں بہت تھوڑی ہوتی ہیں مگر وُہ انہیں اچھی طرح مشاہدہ کرتا ہے۔ کچھ تو اسواسطے کہ وُہ اسکو زیادہ نئی اور دلچسپ معلوم ہوتی ہیں اور کچھ اِسواسطے کہ وہ اسقدر جلدی اُس کے پاس سے نہیں گذر جاتیں کہ وُہ اس کی یادداشت میں نہ رہیں۔ وہ قدرت کو ایسی ہی اچھی طرح جانتا ہے جیسے کہ ایک پختہ عمر آدمی۔ گاؤں میں ہر ایک آدمی ایک دُوسرے کو جانتا ہے۔ وُہ اپنے ہمسایوں کے نیک و بد کاموں کو جانتے ہیں۔ انہیں اپنے خاندان کے بہت سے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اور گھروں میں اس کا تذکرہ رہتا ہے۔ اِس

طرح پر وُہ اوائل عمر ہی سے سُنی سُنائی سوانح عمریوں کا لُطف حاصل کرنے لگتے ہیں۔ ہم اِس بات کو مانتے ہیں کہ یہ باتیں آپس کی گپ شپ سے زیادہ وقت نہیں رکھتیں مگر جہاں گپ شپ ہوتی ہے وہاں دوستی بھی ضرور ہوتی ہے۔ برخلاف اِس کے بڑے بڑے شہروں میں نہ گپ شپ ہوتی ہے نہ دوستی۔ کیونکہ نہ وُہ ایک دُوسرے کو جانتے ہیں نہ پروا کرتے ہیں۔ اگرچہ دیہاتی لڑکا زیادہ آہستہ بڑھتا ہے مگر جب وُہ سن بلوغت کو پہنچتا ہے تو وُہ شہری لڑکے کی نسبت زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ وُہ زیادہ تر اپنے ہاتھ سے سب کام کرتا ہے اور اِس طرح سے سلف ہلپ کا اصُول اس کے دِل میں شروع سے ہی راسخ ہو جاتا ہے۔ جب وُہ شہر میں داخل ہوتا ہے تو وُہ اپنے اِرد گرد تعجب کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو ایک نئی دُنیا میں پاتا ہے۔ پھر اس کا حوصلہ بڑھتا ہے اس کے ارادے زیادہ اُونچے ہوتے ہیں اور وُہ محنت و ہمت سے اُنکو پُورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر اعلےٰ اعلےٰ دنیاوی مراتب پر پہنچ جاتا ہے۔ القصّہ بہت تھوڑے آدمی ایسے ہوئے۔ جنہوں نے سائنس سیاست مدن یا فنون میں ترقی کی۔ اور وہ دیہات کی پیدائش نہیں تھے۔ اِسکی مثالیں بہت سی اور بیّن ہیں۔ سر آئزک نیوٹن سر ہیوج مڈلٹن اور جارج سٹیفن سن دیہات کی ہی پیدائش تھے۔ مذہبی پیشواؤں میں، دیکھئے تو وکلف۔ لوتھر۔ لیٹمر اور ولزی اور خیر خواہانِ ملک و قوم میں کرامول اور واشنگٹن گاؤں کے ہی لوگ تھے۔

علیٰ ہذا القیاس بڑے بڑے مصنفوں اور شاعروں کو دیکھئے تو وُہ بھی دیہاتی زندگی کے ہی اثر سے متاثر تھے۔ سر والٹر سکاٹ۔ شیکسپیر۔ ورڈزورتھ وغیرہ سب اسی قدرتی کالج یعنے دیہات کے تعلیم یافتہ تھے اور اس کے دلفریب نظاروں کو انہوں نے جگہ جگہ اپنی کتابوں اور نظموں میں بیان کیا ہے ٭

محمد سعید (دہلوی)

محل خانہ

سنہ ۱۹۰۳ء میں جو ناول اُردو میں شائع ہوئے ہیں - اگر اُن میں بحیثیتِ مجموعی سیّد علی سجّاد صاحب عظیم آبادی - مصنّف "نئی نویلی" کی اِس تصنیف کو بہترین کہا جائے تو شاید کچھ مبالغہ نہ ہوگا - کتابت کی عمدگی - کاغذ کی خوبی - چھپائی کی صفائی - مصنّف کی پاکیزگیٔ مذاق پر دلالت کرتی ہیں - اور جدید تصنیفات کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کرتی ہیں - کیونکہ ہم روز دیکھتے ہیں کہ کئی اچھّی کتابیں محض ظاہری صورت کے نقائص کی وجہ سے وُہ مقبولیّت حاصل نہیں کر سکتیں - جو اُن کا حق ہے - سب سے بڑی خوبی اس دلچسپ قصّہ میں یہ ہے کہ یہ ایک خاص مقصد کو مدّنظر رکھ کے لکھا گیا ہے - اور مسلمان شرفا کی شادی بیاہ کی رسُوم کی بولتی چالتی تصویر ہے - اس کا سین گو لکھنؤ میں رکھا گیا ہے اور تصویر کے رنگ میں وہاں کے خاص تمدّن کی جھلک ہے - مگر تھوڑی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ یہی کیفیت شمالی ہندوستان کے سب مقامات میں مسلمانوں کے گھروں کی ہے - اِس قصّہ میں اُن تکالیف کا بیان کیا گیا ہے جو دیسی سوسائٹی میں ساس بہوؤں کے دلوں کے نہ ملنے سے پیدا ہوتی ہیں اور جن کے سبب کئی گھروں میں خرابیاں پڑتی ہیں - فسانہ نگاری کے جو اصناف اس وقت یورپ میں مروّج ہیں - اُن میں اس صنف کو جو کوئی مقصد پیشِ نظر رکھے اس زمانہ میں بہت پسند کیا جاتا ہے اور ہمارے مُلک میں ایسے قصّوں کی جو یہاں کی سوسائٹی کے لئے آئینے کا کام دیں - اور بے تامّل سب حسن و قبح جتا دیں - بہت ضرورت ہے - اِس میں شک نہیں کہ ایسے قصّے بحیثیتِ فسانہ اتنے دلچسپ نہیں ہوتے - جتنے وُہ ناول جن میں حُسن و عشق کی داستانیں - یا رزم و بزم کی رنگ آمیزیاں ہوں اور نیز ان میں واقعات کی اُس پیچیدگی کی گنجائش ہوتی ہے - جسے انگریزی میں پلاٹ کہتے ہیں - اور جس گُتّھی کا سُلجھنا ایک لطفِ خاص رکھتا ہے - (چنانچہ محل خانہ میں پلاٹ بہت کم ہے) لیکن ہمیں ابھی نتیجہ خیز ناول زیادہ درکار ہیں - اور اس لئے ہم "محل خانہ" کو جو خوبیٔ ظاہری اور دلآویزی کے ساتھ روزمرّہ کی صفائی اور زبان کی سلاست میں بھی قابلِ داد ہے - خوشی سے

خیر مقدم کہتے ہیں اور اسکی خدمت میں معذرت بھی کرتے ہیں کہ کئی اور رسالوں میں اس کے مفصل ریویو چھپ چکنے کے بعد ہمیں اس کی قابل مصنف کی محنت کی داد کا موقع ملا۔ سید علی سجاد صاحب جنکا کلام نظم و نثر ہمارے ہاں شائع ہو کر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جا چکا ہے۔ اُردو۔ فارسی۔ عربی جاننے کے علاوہ کتب انگریزی سے بھی اچھی واقفیت رکھتے ہیں اور اسی لئے انکی تحریر میں اُن تمام زبانوں کے مطالعہ کا اثر ہوتا ہے۔ آپ گو آج کل عظیم آباد میں سکونت پذیر ہیں لیکن لکھنؤ میں رہنے کا انہیں کئی سال تک موقع ہوا ہے۔ اور وہاں کے طرز بود و باش اور اندازِ سخن سے خوب واقف ہیں اس لئے جو تصویر انہوں نے اپنی کتاب میں کھینچی ہے۔ وہ واقعیت کی صفت سے متصف ہے۔ اور اس لئے قابلِ قدر ہے۔ عقل آرا جو اس قصہ کی جان ہے۔ ایک نہایت ستودہ صفات۔ حلیم اور معقول پسند لڑکی ہے۔ اُسکا خاوند ایک شریف۔ خاندانی نوجوان ہے۔ جسے طبعی کمزوری اور رسمی مروت اُن فرایض میں جو والدین کے متعلق ہیں اور اُن حقوق میں جو بیوی کے اس پر ہیں۔ تمیز نہیں کرنے دیتی۔ ایک طرف وُہ چاہتا ہے کہ بیوی سے کسی طرح بُرا برتاؤ نہ کرے اور دُوسری طرف اپنی ماں سے خائف رہتا ہے اور اسی کشمکش میں اسکی زندگی تلخ رہتی ہے۔ انجام یہ ہے کہ اسکی بیوی قبل از وقت رحلت کر کے گوشۂ لحد میں جا لیٹتی ہے حجم میں یہ کتاب سوا تین سو صفحوں کے قریب ہے اور قیمت تین روپیہ علاوہ محصولِ ڈاک ہے۔ صاحب مصنف سے (عظیم آباد۔ بنگلہ ہاتھی خانہ کے پتہ سے) مل سکتی ہے +

رباعیاتِ حالی۔ منشی محمد رحمت اللہ صاحب رعد مالک نامی پریس کانپور نے اُردو خوان پبلک پر بڑا احسان کیا ہے۔ کہ مولانا حالی کی پُر مضمون اور مفید رباعیات کا ایک نہایت پُر تکلف ایڈیشن شائع کیا ہے۔ جسے با مذاق اصحاب ضرور پسند کرینگے۔ کاغذ چکنا اور دبیز۔ تقطیع موزون۔ ایک ایک رباعی ایک ایک صفحہ پر جلی قلم سے خوشخط لکھی ہوئی ہے۔ کتابت منشی الطاف حسن صاحب شاگرد اعجاز رقم لکھنوی کی ہے۔ جنکی خوبی تحریر اُن کے کمال کی گواہی دے رہی ہے۔ مگر اُن سے ہمیں ایک شکایت ہے اور وُہ یہ کہ اُنہوں نے ہر صفحہ کو اپنے نام نامی سے مزین فرمانا ضروری سمجھا ہے۔ مانا کہ وُہ سپہرِ کتابت کے آفتاب ہوں مگر آفتاب بھی تو کسی وقت غروب ہونا گوارا کر لیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مذاقِ سلیم کو نام کا اس طرح ہر کونے پہ لکھا جانا کھٹکتا ہے۔ خیر یہ تو ایک جزوی نقص ہے۔ ویسے کتاب لاجواب ہے۔ اور جناب رعد کے حسنِ اہتمام کی داد دینی پڑتی ہے حقیقت میں وُہ چھپائی کے فن میں ترقی [illegible] رباعیات کی قیمت ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ۱۲؍ فی جلد ہے۔ گو سرورق پر قیمت لکھی نہیں گئی +

چاند اور چکور

انوکھی آئی نظر حسن و عشق کی تصویر — کہاں چکور بھلا اور کہاں یہ ماہِ منیر
پرند اور عقل دل افروز یہ! عجیب عجیب — جیا یہ ننھا سا اور سوز یہ! عجیب عجیب
نہ چاندنی ہو تو اس کے لئے جہاں اندھیر — جو چاند نکلے تو جلوے سے ہو نہ اسکے سیر
یہ بیقراری ہے دن بھر کہ رات کب آئے — جو اس کا روح رواں کھڑا اسکو دکھلائے
یہ چاندنی پہ ہے مرتا کہ جان پائے گا — "تڑپ کے اڑتا ہے گویا پہنچ ہی جائیگا"
ستم کا شوق ہے شاباش اسکی الفت کو! — غضب یہ فاصلہ! شاباش اسکی ہمت کو

ہوا سمٹ کہ پر و بال رہ گئے تھک کر
قمر! سرک کہ فدائی ترا گرے تجھ پر

سید نذیر حسین (انبالہ)

محبت

کچھ غم نہیں جو رہنے کو دولت سرا نہ ہو — گلگشت کے لئے چمنِ دل کشا نہ ہو
لذاتِ زائقہ کی خبر بھی نہ ہو ذرا — جز نانِ خشک اور کبھی کچھ چکھا نہ ہو
آوازِ خوش کا نام نہ پہنچا ہو کان تک — جز گفتگوئے عام کبھی کچھ سنا نہ ہو
یہ سب نہیں تو خیر - بلا سے نہیں سہی — ہاں لطف سے ترے کوئی نا آشنا نہ ہو
تو وہ طلسم ہے کہ گوارا ہو تیری قید — تو وہ کمند - وائے جو تجھ میں پھنسا نہ ہو

تو وہ مزا کہ ہیچ مزے ترے سامنے | تو لطف وہ کہ تجھ سا کوئی دُوسرا نہ ہو
تو وہ مئے حلال کہ سرخوش رکھے مدام | تو وہ ۔ قمار کھیلنا تیرا بُرا نہ ہو
تو وہ چراغِ ظلمتِ دل میں ہو جسکا نُور | تو وہ شرارِ حیف جو تجھ سے جلا نہ ہو

پھوٹے وہ آنکھ جس میں کرشمہ نہ ہو ترا
برباد ہو وہ دل جسے تیرا مزا نہ ہو

سیّد نذیر حسین (انبالہ)

رخصت اَے بزمِ جہاں!

شیخ محمد اقبال صاحب انجمن حمایت اسلام لاہور کے عظیم الشان سالانہ جلسے کے لئے نظم لکھنے میں بیحد مصروف تھے۔ جب اس رسالہ کی ترتیب کا وقت آ پہنچا ۔ اس لیئے کوئی چیز خاص مخزن کے لیئے نہیں لکھی جا سکی ۔ انہیں دنوں میں انکی ایک دلپذیر نظم دکن ریویو میں چھپی ہے۔ اُسی کو بعض ضروری ترمیموں کے ساتھ وہ ہمیں بغرضِ اشاعت عنایت کرتے ہیں ۔ اکثر حضرات کے لیئے یہ بھی نئی چیز ہوگی :-

رخصت اَے بزمِ جہاں سُوئے وطن جاتا ہُوں مَیں | آہ! اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہُوں مَیں!
بسکہ مَیں افسردہ دل ہُوں درخورِ محفل نہیں | تو مرے قابل نہیں ہے میں ترے قابل نہیں!
قید ہے دربارِ سلطان و شبستانِ وزیر | توڑ کر نکلیگا زنجیرِ طلائی کا اسیر
تیر لگتی ہے نگاہِ چشمِ نو دولت مجھے | ہے ترے عجزِ خوشامد زادہ سے نفرت مجھے
گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے | اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا — مدتوں بے تاب موج بحر کی صورت رہا
مدتوں بیٹھا ترے ہنگامۂ عشرت میں میں — روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں
مدتوں ڈھونڈا کیا نظارۂ گل خار میں — آہ! وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں
مدتوں ضبطِ تکلم کے ستم سہتا رہا — اشک کی صورت میں اپنا حالِ دل کہتا رہا
خامشی کا بار لیکن اب اٹھا سکتا نہیں — آئینہ مشرب ہوں راز اپنا چھپا سکتا نہیں
چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے — آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے!

چھوڑ کر مانندِ بو تیرا چمن جاتا ہوں میں
رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں

گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں — آہ! یہ لذت کہاں موسیقیٔ گفتار میں!
ہم نشینِ نرگسِ شہلا رفیقِ گل ہوں میں! — ہے چمن میرا وطن ہمسایۂ بلبل ہوں میں
شام کو آواز چشموں کی سلاتی ہے مجھے! — صبح فرشِ سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے
مل کے رہتی ہیں تہِ دامانِ دریا مچھلیاں — یعنی وہ چاندی کے طائر بے پر و بے آشیاں
مل کے اڑتے مل کے گاتے ہیں گلستاں کے طیور — خیمہ زن انساں ہیں شہروں میں نیستانوں سے دور

باغِ عالم میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند

ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں؟ — ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں؟
شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے؟ — اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے؟
کوہ کے دامن میں کیا بے مدعا پھرتا ہوں میں — کیا مصافِ زندگی سے بھاگتا پھرتا ہوں میں
طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنجِ عزلت کا ہوں میں — دیکھ اے غافل! پیامی بزمِ قدرت کا ہوں میں
ہم وطن شمشاد کا قمری کا میں ہمراز ہوں! — اس چمن کی خامشی میں گوش بر آواز ہوں
کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لیے — دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لیے

عاشقِ عزلت ہے دل۔ نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں!
لیٹنا زیرِ شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
شام کے تارے پہ جب پڑتی ہو رہ رہ کر نظر

علم کے حیرت کدہ میں ہے کہاں اسکی نمود
گُل کی پتّی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بُود!

اقبال

آرزوئے صحت

ایک دفعہ حکیم محمد واصل خاں صاحب کا علاج کرنے کے لئے مرحوم عبدالرشید چشتی دہلی جانیکو تھے۔ تو چند اشعار جناب حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کو لکھ لئے۔ جنکو پیش کرنیکی نوبت ہی نآئی:۔

ضُعفِ معدہ عارضہ میرا پُرانا ہو گیا
جس سے اب بالکل مجھے دشوار جینا ہو گیا
سال و ماہ و روز و شب میرے گذرتے ہیں یونہیں
اکتسابِ علم و فن کے دن نکلتے ہیں یونہیں
دن بدن مایوس ہوتے جاتے ہیں میری عزیز
مُنہہ سے گو کہتے نہیں پر دل میں رکھتے ہیں تمیز
لائی ہے شہرت مجھے تیری مسیحائی کی یہاں
ایک عالم آج ہے اس گھر کے فن کا مدح خواں
تیرے باپ اور بھائی کے احسان سب کو یاد ہیں
تیرے حُسنِ خلق سے بھی اہلِ دوراں شاد ہیں
فیض ہے اس در کا جاری ایکساں صبح و مسا
شاہ سے پہلے یہاں ہی پُوچھا جاتا ہے گدا
حکمتِ یوناں کا باقی نام ہے گھر سے ترے
ہند میں اس فن کا جاری کام ہے گھر سے ترے
تھیں اُمنگیں سینکڑوں دل میں رہی جاتی ہیں سب
خوبیاں جو تھیں طبیعت میں دبی جاتی ہیں سب
ساتھ چھوڑا ہے نہیں ابتک مگر اُمید نے
رہنمائی کی ہے اس رنگ میری اُمّید نے
گوہرِ مقصد کو آخر آج میں نے پالیا
پالیا میں نے شفا کو جب یہاں تک آلیا

عبدالرشید چشتی۔ مرحوم

صُبح

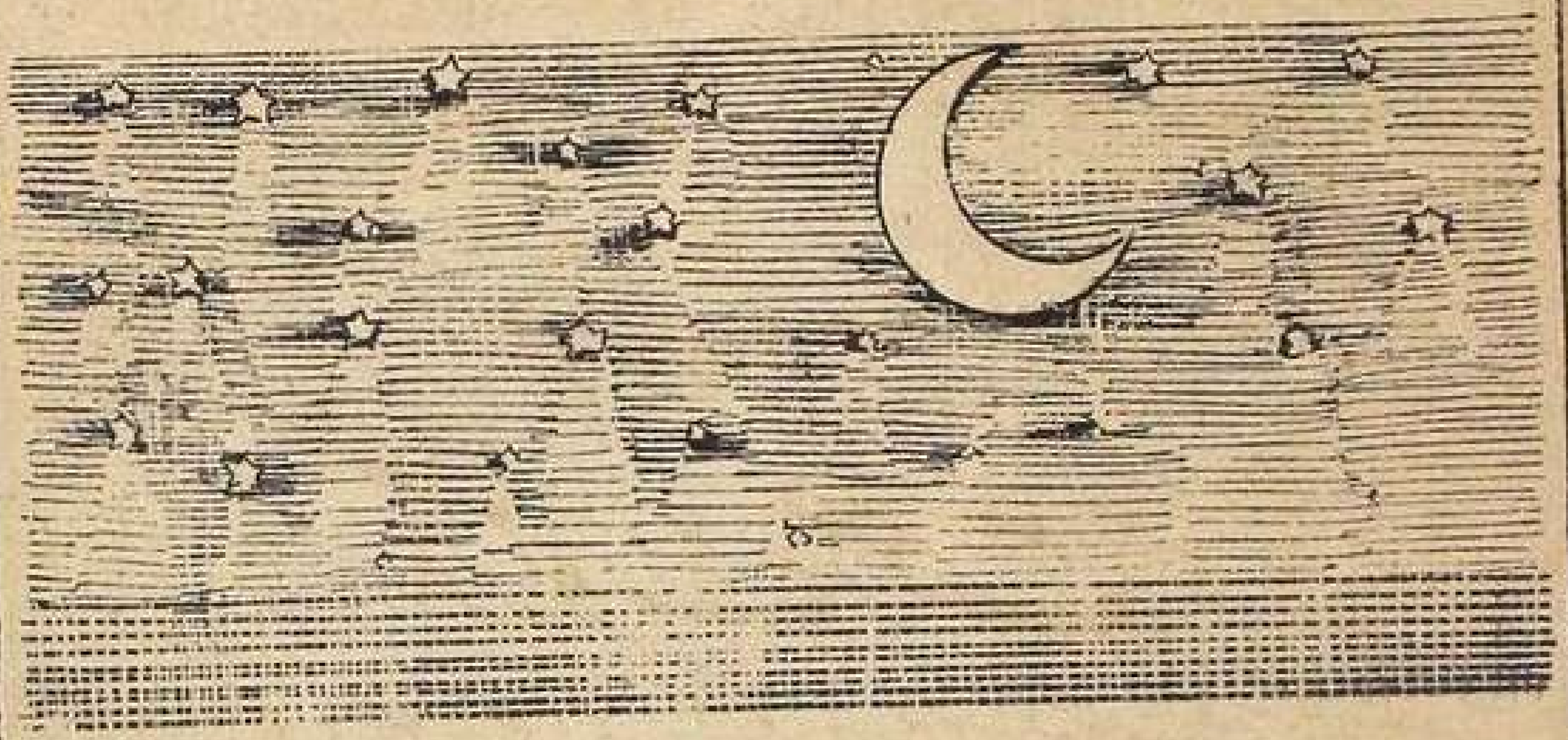

لیجئے! صبح کا تارا چمکا!! ایلو! ہوگیا نُور کا تڑکا!!
مُرغ نے ککڑوں کوُں کی صدا دی فجر کی کر دی گجر نے مُنادی
پڑ گئی پھیکی چاندنی بالکل ہونے کو شمعِ ماہ بھی ہے گُل!
رات کا کیا دُنیا سے سفر ہے چلنے پہ ہر اک باندھے کمر ہے
ڈُوب رہا ہے اِک اِک تارا چاند نے ہجرت کی ہے گوارا
جھلمل جھلمل کرتے تارے جی ہیں لُبھاتے لگتے ہیں پیارے!
نُورِ سحر کا مُلک غازہ حُسن کیا ہے فلک نے تازہ!
تڑکا۔ نُورِ ظہُور کا عالم سر سے پا تک نُور کا عالم
ایسا سماں ہے جسکو دیکھو ہے وُہی موہے لیتا دل کو
دی جو نسیمِ سحر نے تھپکی بیماروں کی آنکھ ہے جھپکی
بچے جو اُٹھے روتے روتے ماؤں نے تھپکے سوتے سوتے
آئی صدا مسجد سے اذاں کی! طاعتِ حق کو دوڑے نمازی!

کوئی اُٹھا انگڑائیاں لیتا   بیٹھا کوئی جمائیاں لیتا
کوئی اُٹھا ہے کلمہ پڑھتا   بیٹھا ہے کوئی ہر ہر کرتا
طائر اپنی اپنی زباں میں   محو ہیں حمدِ خدا کے بیاں میں
شاہ جی دیکھو تُور کے تڑکے   منقبتیں پھرتے ہیں پڑھتے
پنڈت باندھے تلک لگا کے   بیٹھے آسن پر پُوجا کے
سُن کر سنکھ کی دُھوتو دُھوتو   جانے لگے مندر کو ہندو
بیلوں کے کندھوں پر ہل رکھ کر   نکلا کسان ہے گھر سے باہر
گلیوں میں کہتی پھرتی ہے گھوسن   "تازہ تازہ لے لو مکھن"

باغ کا عالم دیکھے کیا ہے   صحنِ چمن کیا خوب سجا ہے!
آنکھوں کو بوٹا بوٹا ہے بھاتا   جی کو ہے پتہ پتہ لُبھاتا
قطرے نہیں شبنم کے پڑے ہیں   پتوں پہ گویا موتی جڑے ہیں
پٹڑی پٹڑی - کیاری کیاری   سُتھری سُتھری - پیاری پیاری
جوہی - چنبیلی - سیوتی - بیلا   ق   سیب - بہی - خوبانی - کیلا
سنبل - سوسن - نرگس - لالہ   ۲   ٹہنی - تنہ - پھُنگی اور پھالا
اسدم جتنا ملکِ زمیں ہے   ۳   شبنم کے سب زیرِ نگیں ہے
پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو   دل پہ کئے لیتی ہے قابو
مہک رہا ہے گلشن سارا   بکھرا ہے گویا عنبر سارا
سجکر اوس کا پُر دُر زیور   سبزے کے اور ہی ہو گئے تیور!!
بادِ سحر ہے جھونکا دیتی   ڈالی زمیں کا ہے بوسہ لیتی
ٹہنی ٹہنی پر ہے پرندا   گاتا گیت ثنائے خدا کا

ڈالی ڈالی ہری بھری ہے بوٹا ہے یا سبزپری ہے

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چمن میں ڈال رہی ہے جان سی تن میں

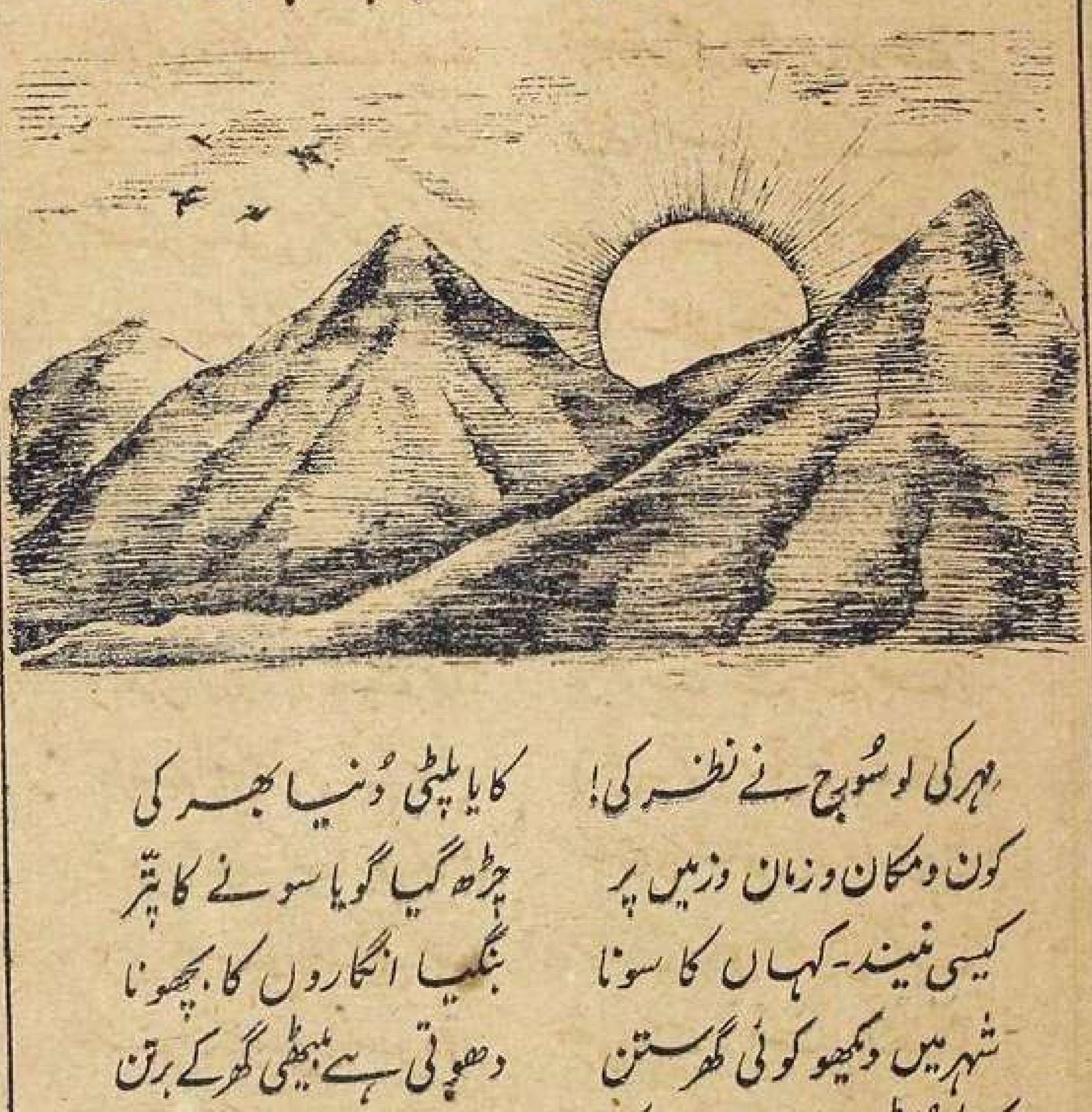

مہر کی لو سورج نے نظر کی! کایا پلٹی دنیا بھر کی
کون و مکان و زماں و زمیں پر چڑھ گیا گویا سونے کا پتّر
کیسی نیند - کہاں کا سونا بنگیا انگاروں کا بچھونا
شہر میں دیکھو کوئی گھر ستن دھوتی ہے بیٹھی گھر کے برتن
کوئی اٹھی ہے جھاڑو دیکر جھاڑ رہی ہے کپڑے بستر
بچّوں کا منہ اک نے دھلوا کر رکھدیا آگے ناشتہ لاکر
لڑکوں نے لے بغل میں بستہ گھر سے لیا اسکول کا رستہ
ہیں آ - تو آ - یہ آ - وہ آ لگ گئی بازاروں میں رچنا
گاتا ہے کوئی بھیرویں - آسا سُر کہیں ہوتا ہے طنبورا
گھوڑا - بگھی - ٹٹّم - یکّہ شکرم - ٹانگا - بہلی - چھکڑا

جس کے جدھر ہیں سینگ سماتے — آتے جاتے نظر ہیں آتے
کوئی ہوا کھانے کو ہے نکلا — کوئی ہے مزدوری کو جاتا
بائی سکل پر کوئی چڑھا ہے — پیدل کوئی آگے بڑھا ہے
منشی - بابو فیشن ایبل — دیکھ رہے ہیں ٹائیم ٹیبل
لیس ہوئی ہے خلقت ساری — کاروبار کی ہے تیاری
صبح کی خوبی و لطف کا عالم — جتنا بیاں ہو اتنا ہے کم
کوئی کہاں تک لکھتا جائے
کوزے میں دریا کیسے سمائے

سید علمدار حسین از ریاست پٹیالہ

کارنامۂ عشق

میرے محترم دوست مولینا محمد یوسف صاحب جعفری "رنجور" نے خواجہ حالی کی اس نفیس غزل پر مصرع لگائے ہیں جس میں حضرت نے ایک ایک کر کے عشق کے سارے ہتھکنڈے گن دیئے ہیں - مگر وہ تو دو دو ہی تھی - خیر سے یہ تین تین مصرع اور چسپاں ہو گئے ایک اچھا خاصا خمسہ ہو گیا - اب اس کے "کارنامہ" عشق ہونے میں کچھ کسر باقی نہ رہی - خواجہ صاحب کا کلام، اسپر حضرت رنجور کے مصرع - سونے میں سہاگہ - نذر کرتا ہوں -

ابوالنصر آہ دہلوی

اے عشق تو نے آخر فتنہ اٹھا کے چھوڑا — جو ہنس رہے تھے انکو تو نے رلا کے چھوڑا

جو شمعِ خانداں تھے اُنکو۔ بُجھا کے چھوڑا — اے عشق! تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اُٹھایا۔ اُسکو بٹھا کے چھوڑا

ڈٹ جائے تیرے آگے کوئی! یہ کیا ہے امکاں؟ — سُنتے ہی نام تیرا۔ سب ہوتے ہیں ہراساں
خائف ہیں تجھ سے ہندو۔ ہیبت زدہ مسلماں — ابرار تجھ سے ترساں۔ احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا۔ اُسکو گرا کے چھوڑا

تُو نے ڈبوئے۔ اے عشق! اکثر بھری سفینے — تیرِ بلا سے چھلنی کر ڈالے کتنے سینے
ہرگز نہ فتح پائی تجھ پر کسی جری نے — رایوں کے راج چھینے۔ شاہوں کے تاج چھینے
گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

اے عشقِ راہزن! ہے تیرا غضب کا ڈاکا — کرتا ہے دم کے دم میں خالی۔ بھرا خزانا
کیا عالموں کی دانش۔ کیا علم و فضل اُن کا — کیا منعموں کی دولت۔ کیا زاہدوں کا تقویٰ
جو گنج تو نے تاکا۔ اُسکو لُٹا کے چھوڑا

برگشتہ جب کسی سے اُس کا ہوا مقدر — قسمت سے بنگیا تو اُس راہرو کا رہبر
سب راہگیر تجھ سے ڈرتے رہے ہیں اکثر — جس رہگزر میں بیٹھا تو غولِ راہ بن کر
صنعاں سے راست رَو کو رستا بُھلا کے چھوڑا

دُنیا سے ہیں نرالے۔ اے عشق! تیرے آئیں — ظلم و ستم پہ مبنی ہیں سب ترے قوانیں
وامق نے کیسی کیسی تکلیفیں تجھ سے پائیں — فرہادِ کوہکن کی لی تُو نے جانِ شیریں
اور قیسِ عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

لاتی ہے آدمی پر آفت تیری حضوری — ہر شخص کو خدا دے۔ اے عشق! تجھ سے دوری
نبیوں کو بھی ستانا کیا امر تھا ضروری؟ — یعقوب سے بشر کو دی تو نے ناصبوری
یوسف سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

کیوں شوق سے اُٹھاتے ہیں لوگ ناز تیرے؟ — ہم کیا کہیں؟ کہ مخفی ہیں سارے راز تیرے

فریاد و آہ دونوں ہیں ساز باز تیرے | لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دلگداز تیرے

پتھّر کے دل تھے جنکے اُنکو رلا کے چھوڑا

جو جو ادا ہے تیری - اے عشق! وُہ ہے بانکی | ہے دنگ تیری چالوں سے عقل اک جہاں کی

بتلا - یہ تجھ میں آئیں عیاریاں کہاں کی؟ | عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چپقلش جہاں کی

عقل و خرد کا تُونے خاکا اُڑا کے چھوڑا

دُنیا کے جو اکھاڑوں میں ور رہے ہمیشہ | ادنےٰ سے تیرے کرتب سے وُہ گرے ہمیشہ

عالم - ادیب - دانا تجھ سے دبے ہمیشہ | علم و ادب رہے ہیں دبلے تیرے ہمیشہ

ہر معرکے میں تونے اُنکو رلا کے چھوڑا

پہلے ہی سے پڑی ہے بُنیاد تیری دلکش | جور و جفا کی ہر اک ایجاد تیری دلکش

دل ساز تیرا نغمہ - فریاد تیری دلکش | افسانہ تیرا رنگیں - روداد تیری دلکش

شعر و سخن کو تونے جادو بنا کے چھوڑا

میں سیر کو جہاں کی اک دن گیا ہوا تھا | واں قافلہ دلوں کا - دیکھا - لُٹا ہوا تھا

رنجور بھی زمیں پر مُردہ پڑا ہوا تھا | اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا

اُس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

محمّد یوسف جعفری رنجور

(از کلکتہ)

سُنہری قطعات :- خوبصورت چھپے ہوئے سُنہری قطعات جنپر متبرک آیات لکھی ہوئی ہیں - مصر میں تیار ہوئے ہیں - یہاں ایک صاحب نے فروخت کے لئے منگوائے ہیں - انکے چند نمونے اسوقت ہمارے سامنے ہیں مُسلمان گھروں کے سامانِ آرائش میں اچھا اضافہ ہیں - **قیمت** فی قطعہ ۸ر - مگر چار کے خریدار سے رعایت ہوگی - چار ۱عیر میں ملتے ہیں - محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا + **شیخ امام الدّین صاحب** (مزنگ روڈ - لاہور) سے طلب کئے جائیں +

قصیدۂ شاطر

کلامِ شاطر کا نمونہ ماہ فروری کے پرچے میں درج ہو چکا ہے۔ یہ ایک اور پُرزور قصیدہ اُسی قلم سے نکلا ہے :-

دیکھ لی ہجر میں ساقی کے مری نوحہ گری
آج گرمائیگی پہلو مرا شیشہ کی پری

دِل جلوں کی تری ہی دم سے بندھی رہتی ہے آس
رکھے اللہ سلامت تجھے داغِ جگری

بیم و اُمید کا کھٹکا ہی نہ رکھا باقی
تجھ کو کیا کہکے دُعا دیجئے اے بے اثری

عالمِ نزع میں اِک پردہ نشیں کی ہے تلاش
ہائے ظاہر کئے دیتی ہے پریشاں نظری

آبرو تیری پہ پھر جائے گا پانی اے ابر
جوش پر آئیگی جب دم مری آنکھوں کی تری

مَیں نے مرقد میں کفن کے بھی اُڑائے پرزے
تیرے وحشی کی ہے زوروں پہ ابھی جامہ دری

دِل جلا مَیں بھی ہُوں ہو جاؤنگا ٹھنڈا آخر
دو گھڑی اور مرا ساتھ دے شمعِ سحری

گرم نالے جو کروں آگ لگے جنّت کو
ٹھنڈی آہیں جو بھروں سرد ہو نارِ سقری

مری بیتابیٔ دِل ہے تری شوخی کا جواب
جوڑ غمزے کا ترے میری پریشاں نظری

لاکھ معشوق میں تم فرد ہو عشاق میں مَیں
شہرتِ حسن سے ٹکراتی ہے شوریدہ سری

نشترِ تیز ہے خود ترچھی نظر قاتل کی
زہر میں اور بجھاتی ہے اسے عشوہ گری

تشنہ لب تیر بھی اس ترک کا ہے مژگاں بھی
دونوں مہمانوں کے کام آتا ہے خونِ جگری

فتنۂ حشر کا کیا حشر ہو دیکھیں تو سہی
کہ اُڑاتا ہے تمہاری روشِ فتنہ گری

نگہِ شوخ نے گھونگٹ میں کیا دِل ٹکڑے
نظرِ شوق نے بھی خوب ہی کی پردہ دری

منّتیں کرکے منایا ہے کسی کو شبِ وصل
پھر ترے شور میں کیا دیر ہے مُرغِ سحری

ضُعف سے ہل نہیں سکتا ہُوں مدد کر مری آج
اُس کے قدموں پہ لٹا دے مجھے دردِ جگری

حالِ ایامِ جدائی کا سُنا دے جا کر　　عمرِ رفتہ ہے مناسب پئے پیغام بری
بدگمانی نہیں صیّاد کے دل میں مجھ سے　　آڑے آئی ہو اڑے وقت میں بے بال و پری
محفلِ یار میں ٹوٹے نہ کہیں اشکوں کا تار　　آج کرنا نہ کمی جوش میں خونِ جگری
دامنِ یار ہے ناصح کا گریبان نہیں　　دیکھ اچھّی نہیں اے دستِ جنوں جامہ دری
دیکھتے ہی اسے بھر آتی ہیں میری آنکھیں　　مانعِ دید ہوئی جاتی ہے اشکوں کی تری
میرے ماتم میں بھلا غیر نہ روئے کیونکر　　کہیں جاتی ہے تری عادتِ بیدادگری
رل چکے خاک میں اب قبر ہمیں دے نہ فشار　　پیستا تھا کبھی ہم کو فلکِ نیلوفری
ہم کو ساقی سے غرض کچھ ہے نہ مے سے مطلب　　دل رہے پاس، سلامت رہے خونِ جگری
جب تلک پیارے تھے تم جان بھی پیاری تھی ہمیں　　اب ہیں ہم اور عجب طرح کی ہے بے خبری
ہو ہی جائیگا مقدّر میں جو کچھ ہونا ہے　　اب نہ دیکھیں گے تجھے اے فلکِ نیلوفری
میرا مطلب اُسے سمجھا دے خدایا دمِ نزع　　کچھ اشاروں میں جو کہتی ہو پریشاں نظری
ایک اُمّید پہ جیتا ہوں خدارا ای یاس　　قیدِ ہستی کی کشاکش سے مجھے کر دے بری
رشک کہتا ہے خبردار نہ کرنا اُف تک　　محفلِ غیر میں اُٹھتا ہے جو دردِ جگری
عشق میں زلفِ پریشاں کے ہوا ہوں برباد　　خاک بھی میری اُڑاتی ہے نسیمِ سحری
خیر کچھ غم نہیں اتنا تو کر احسان صبا　　خاک پہنچا دے سوئے روضۂ خیر البشری
مدح میں شاہ کی پڑھتا ہوں وہ مطلعِ شاطر　　سر کو دھننے لگیں سُنتے ہی جسے جن و پری
رحمتِ عام کے باعث ہو تری ناموری　　تیرے قربان ہیں اے شافعِ جرمِ بشری
ناخنِ فکر نے حل کر دیئے عقدے سارے　　تیرے آگے تو ہے مانند بدیہی نظری
تیغِ ابروئے ہلالی کا ترے واہ رے کاٹ　　لوگ کہتے ہیں جسے معجزۂ شق القمری
شکلِ رابع سے نتیجہ کو کرے استخراج　　رائے سے تیری جو حیوان کو ہو بہرہ وری
علّتِ غائیِ ایجادِ دو عالم تری ذات　　معنوی اس میں فضائل ہیں بھرے اور صوری

جلوہ گر سینے میں ہے داغِ محبت تیرا اسی گرمی سے مرے جسم کی رگ رگ ہے بھری
تیرا بندہ ہے جو تتطرا اسے جبدم دیکھا
خوف سے کانپ اُٹھا شعلۂ نارِ سقری

عبدالرحمٰن شاطر

چھوڑ دیا

دوستو صادقِ محزوں نے وطن چھوڑ دیا — بُلبلِ زار نے رہ رہ کے چمن چھوڑ دیا
صُورتِ خار نکالے گئے اس گلشن سے — جس طرح حضرت آدم نے عدن چھوڑ دیا
رہ گیا ٹوٹ کے پیمانِ وفاداریِ گل — یعنے تو نے ہمیں او عہد شکن چھوڑ دیا
لاکھ بھُولا کئے پر یاد تمہاری نہ گئی — تم نے کیونکر ہمیں یارانِ وطن چھوڑ دیا
اب نہیں جنسِ محبت کا خریدار کوئی — وہ مگر اہلِ زمانہ نے چلن چھوڑ دیا
اے صبا آج سے لے تو بھی سبکدوش ہُوئی — ہم نے عشقِ گل و نسرین و سمن چھوڑ دیا
صحنِ گلزار میں پھیلی ترے گیسو کی مہک — لا کے پنجاب میں آہوئے ختن چھوڑ دیا
سرِ شوریدہ سے نکلی نہ ہوائے پرواز — تو نے پر کاٹ کے جو مُرغِ چمن چھوڑ دیا
دلِ بے تاب کی آرام سے اب بھی نہ کٹی — گرچہ اندیشۂ کالا و کفن چھوڑ دیا
سچ تو یہ ہے کہ جہاں میں نہیں بے عیب کوئی — تری تصویر میں مانی نے دہن چھوڑ دیا
طوطیو تم کو مُبارک شکرستانِ خیال — ہم نے رنجِ غزل و فکرِ سخن چھوڑ دیا

کوئی پُوچھے تو بھلا صادقِ دلگیر نے کیوں
شیوۂ سحر بیانانِ کہن چھوڑ دیا

صادق

کلامِ شاد

ہمیں ان اوراق میں وقتاً فوقتاً جناب خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد رئیس عظیم آباد کا کلام شائع کرنے کی عزت حاصل ہوئی ہے۔ جناب شاد ایک قادر الکلام سخنور ہیں۔ جنکی محققانہ طبیعت۔ جنکے اخلاق۔ اور جنکے بیان کی سلاست بزرگانِ سلف کو یاد دلاتی ہیں۔ اور اُن کا شمار اس زمانہ کے اساتذہ فن میں ہے۔ خصوصاً بہار اور بنگال کی طرف انکے مدّاح بےشمار ہیں۔ اور لوگ اُن کے اشعار سُننے یا پڑھنے کے بیحد مشتاق رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے عنایت فرما جناب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال کا مشکور ہونا چاہئے جنکی بدولت ہمیں ایک معقول مقدار جناب شاد کے کلام کی مل گئی ہے۔ جس کا ایک حصّہ آج شائع کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ محض ایک آدہ غزل سے اُنکے مشتاقوں کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ پہلے دو قطعے درج کئے جاتے ہیں۔ جن سے حضرت شاد کی شاعری کا خاص رنگ اور مذاق بخوبی کُھل سکتا ہے:۔

ہر چند ہیں مذاقِ تصوّف میں اپنے شعر — تقلید ہے اساتذہ روزگار کی
ہیں وحدتِ وجود سے مضمون مگر الگ — اک طرزِ خاص پر ہے روش خاکسار کی
سب کچھ ہے پھر جدا نہیں کوچۂ شرع کے — مُہریں ہیں اس سخن پہ شریعت مدار کی
کیونکر کہوں کہ دل کو نہیں معرفت کا جوش — بُلبل کو ہوتی ہی ہے تمنّا بہار کی
عرفان و عشق یُوں ہیں حقیقت میں مُتّحد — جیسے موافقت ہو ہوا سے غبار کی
ہر شعر میں ہے معرفت و عشق کا بیاں — لفظوں میں ہے چھپی ہوئی تصویر یار کی
مضموں ادق ہیں اس لئے حاجت ہے شرح کی — ہر چند میں نے سہل روش اختیار کی
ظاہر میں صاف ہیں باطن میں ہیں متین — دیکھو بہار قدرتِ پروردگار کی

یہ سہل ممتنع اُسی فیاض کا ہے فیض — کیا تھی بساط بندۂ بے اعتبار کی

دیگر

مکلف ہے اگر اے دوست سُن تکلیف شرعی کو — ہمارا موعظہ یہ ہے نصیحت اسکو کہتے ہیں
وضو کے بدلے خاکِ انکساری سے تیمم کر — تخلّی کے یہ معنے ہیں طہارت اسکو کہتے ہیں
جہاں تک ہو سکے آلائشوں سے پاک کر دل کو — یہی ہے رُکنِ اعظم۔ فرض نیت اسکو کہتے ہیں
ہمیشہ رہ اُسی محراب ابرو کے تصور میں — قیام اس کا لقب ہے۔ استقامت اسکو کہتے ہیں
وہ باتیں کر جو سچی ہوں۔ وہ چالیں چل جو سیدھی ہوں — نمازیں اصل یہ ہیں اور عبادت اسکو کہتے ہیں
نہ سُن غیبت نہ کر غیبت۔ نہ دیکھ اوروں کے عیبوں کو — یہی ہے صوم۔ روزہ۔ درحقیقت اسکو کہتے ہیں
کبھی جائز نہ رکھ آزار دینا ایک پشہ کا — کہ حجِ کعبۂ اخلاص و خلّت اسکو کہتے ہیں
رمنا ہے یہ جہاں۔ قربان کر اپنی تمنا کو — صفائے قلب حاصل کر۔ انابت اسکو کہتے ہیں
قُوا جیسے ملے ہوں کام لے کچھ سوچ کر اُن سے — اسی میں ہو رضا اُنکی۔ اطاعت اسکو کہتے ہیں
ہر اک کی دردمندی کر۔ ہر اک کی غمگساری کر — غضب سے دُور رہ۔ پاسِ طریقت اسکو کہتے ہیں
رسا ہے عقل تیری۔ کام لے غور و تامل سے — نہ چھوڑ انساں کی خصلت آدمیت اسکو کہتے ہیں
پہن لے جو ملے۔ کھالے۔ وہاں سے جو عنایت ہو — قدم حد سے نہ رکھ آگے۔ قناعت اسکو کہتے ہیں
یہ ہیں اسلام کے معنے۔ یہ دینداری کی باتیں ہیں — کوئی پوچھے تو کہدینا۔ شریعت اسکو کہتے ہیں

کوئی سبب نہیں دشمن ہو کیوں فلک تیرا — اس امرِ خاص میں اے دل بجا ہے شک تیرا
کروں نہ تجھ پہ مباہات کس طرح اے دوست — ہوا نظیر نہ دُنیا میں آج تک تیرا
دہانِ زخم نہ دیں کس طرح دُعا قاتل — تمام عُمر تو کھایا کئے نمک تیرا

مقامِ رشک ہے کیونکر تجھے پکارے شاد
بہت سے ناموں سے ہے نام مشترک تیرا

دام ہاتھوں میں لئے تاک میں صیاد آیا
پھول کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ میں یاد آیا

کس سے کس سے نہیں شرمندہ ہوں اے دیدۂ شوق
تو جو ہنگامۂ محشر میں۔ مجھے یاد آیا

خیریت بلبلِ شیدا کی خدا سُنوائے
آج کیوں باغ سے روتا ہوا صیاد آیا

شاد ایسے میں نہ توڑا تھا بھلے کو میں نے
پھول پر ہاتھ بڑھایا تھا کہ دل یاد آیا

دل اُس گلی میں جا کے نہ کیوں بے سبب رہا
ذرّہ کی کیا بساط کہیں جا کے دب رہا

گستاخ تھا پہنچ گیا پروانہ شمع تک
میں بدنصیب تھا مجھے مانع ادب رہا

طوفاں کا ظلم ایک طرف۔ موج اک طرف
جس وقت تک حباب رہا جاں بلب رہا

زاہد سے جب سنو تو زباں پر ہے ذکرِ حور
نیّت ہوئی خراب تو ایماں کب رہا؟

اے شاد بعدِ مرگ ہے دل پر مجھے عجب
کیونکر عدم میں جا کے یہ دنیا طلب رہا

رہیگا وردِ زباں اوروں کو نام ترا
سند ہوا فصحا کے لئے کلام ترا

ہوئے خموش لیا جب کسی نے نام ترا
خوش اعتقاد ہیں کرتے ہیں احترام ترا

مطیعِ عشق بنایا ہے ایک عالم کو
کہاں کہاں نہیں جاری ہے حکمِ عام ترا

وُہ ولولے نہ رہے وہ صفائیاں نہ رہیں
مگر دلوں میں نہیں ان دنوں مقام ترا

نہ اضطراب ہے باقی نہ بیقراری ہے
ہمیں تو موت نے پہنچا دیا پیام ترا

تجھی کو آگے ترے جا کے بھول جاتی ہیں
جو نام صبح سے رٹتے ہیں تا بہ شام ترا

تو ہی بتا کہ رسائی ہو شاد کی کیونکر؟
کمندِ آہ سے اونچا بہت ہے بام ترا

دل کو اے یار سمجھ عاشقِ شیدا اپنا
دیکھ اس آئینہ میں بے پردہ تماشا اپنا

جب کسی نے حال پوچھا رو دیا
چشمِ حسرت تو نے مجھ کو کھو دیا

ہوں سادہ دل ترے وعدہ کا انتظار رہا
لحد میں بھی مجھے تا حشر انتظار رہا

ہر طرف ہے وہی ہر شے میں ہے جلوا اُس کا
ترکِ نعمت جو کروں ترک ہے گویا اُسکا

چشمِ بینا میں کہاں چھپتی ہے دو دن کی بہار
گُل جو کھلتے ہیں تو ہنس دیتا ہے شیدا اُسکا

"نہ ملے گا وہ کبھی" - یوں نہ کہو نامہ برو
ڈھونڈھ لیگا کسی تدبیر سے جویا اُسکا

اپنی ناکامی کا کیا ذکر مگر حشر کے دن
کیا قیامت ہے کہ مُنہ دیکھیگی دُنیا اُسکا

ہو خفا اس سے تو جائے کدھر اسکا عاشق
باغ اس کا ہی جو اے شاد تو صحرا اُسکا

پھر ضرر کیا تری یکتائی میں پیدا ہوتا
تجھ سا ہوتا جو کوئی وہ بھی تجھی سا ہوتا

جسمِ خاکی کے تعلق نے گرانبار کیا
کاش میں راہ تری تن تنہا ہوتا

میں اک حسرت و اندوہ کا پُتلا ٹھہرا
بھول جاتا تجھے پر تو تو نہ بھولا ہوتا

جلوہ گر تو نہ ہوا ناز نے کیا کام کیا
میں ہوں جس طرح یوں ہی تو بھی تماشا ہوتا

خاک سے پاک ہوا مُفت میں برباد گیا
کاش اس خاک کے اندر بھی یہ پُتلا ہوتا

تیری غفلت کا جو دھیان آتا ہی دل کہتا ہے
بھولتا میں کبھی اگر وہ مجھے بھولا ہوتا

درد اُلفت سے قوی ہوتی ہے روح اس تن میں
اور بڑھتا یہ مرض شاد تو اچھا ہوتا

خوشا وہ وقت کہ عالم میں تو ہی تو ہوگا
جدھر کو آنکھ اٹھاؤ مقامِ ہُو ہو گا

کبھی تو آپ کے حسرت زدہ سمجھ لینگے
کبھی تو موقعہ اظہارِ آرزو ہوگا

زمانہ گذریگا رندوں کا اس بہار میں یوں
کہ لب پہ نام ترا ہاتھ میں سبو ہوگا

جواب ہم تیری باتوں کا کیا ابھی پوچھیں
خدا کو علم ہے کیا طرزِ گفتگو ہوگا

خیالِ رنج نہ دیگا اجازتِ گفتار
ترا غبار مجھے سُرمہ گلو ہوگا

کبھی تو یاد کرو وہ بھی دن کہ جب اے شاد
بغل میں دفترِ غم یار رُوبرو ہوگا

آسماں نے بھی اسی چال کو مانا ہوگا
چلتے چلتے یہی تاکید کہ آنا ہوگا!

جب بُلاتا ہُوں تجھے تو نہیں آتی دُنیا
بیسواؤں نے بھی منت کو نہ مانا ہوگا

بال سُلجھاتے ہیں ہر وقت مگر میرے بعد
یُوں ہی رکھا ہوا آئینہ پہ شانا ہوگا

رُوح چھپتی ہے جو آتا ہے عدم کا مذکور
مَوت کہتی ہے مقرّر تجھے جانا ہوگا

زندگی تک فقط اے شاد عداوت کرلے
میرے مرجانے پہ مدّاح زمانا ہوگا

کچکول

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیرِ منّتِ خلق
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

فقیر دوست جو ہو ہم کو سرفراز کرے
کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے

(انیس)

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ وا کیا آسماں پیدا ہوئے

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

یک بیک ایسا زمانے میں ہوا ہے انقلاب
قدرداں سب اُٹھ گئے ناقدرداں پیدا ہوئے

ہر کوہ پر نہ ہوگی تجلّی مثالِ طور
ہر ہاتھ کے لیے یدِ بیضا نہ چاہیے

(انیس)

نگاہ نامۂ اعمال پر جو کی پسِ مرگ
گنہگار نظر آیا بال بال مجھے
پھڑک پھڑک کے مرونگا وہ نیم بسمل ہوں
فلک نے کُند چھری سے کیا حلال مجھے

(رر)

مکیں رہے نہ مکاں طرفہ کارخانہ ہوا
زمیں اُلٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا
کشاں کشاں مجھے جانا پڑا وہاں آخر
جہاں جہاں مری قسمت کا آب و دانہ ہوا

(رر)

مثلِ بوئے گل سفر ہوگا مرا
وہ نہیں میں جو کسی پر بار ہوں

(رر)

تلاطم سے نکلا ہمارا جہاز
مناسب موافق ہوا ہو گئی
بہت ڈر سمندر کی لہروں سے تھا
طبیعت مگر آشنا ہو گئی

(رر)

چھپتی نہیں بوئے دوستانِ یکرنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

(رر)

سوؤ گے کب تک بس اٹھو اب انیس
دن بہت غفلت میں تھوڑا رہ گیا

(رر)

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو
کہیں جو ہو گیا پھیرا صدا سنا کے چلے
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے
ملا جنہیں انہیں اُفتادگی سے اوج ملا
اُنہیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

(رر)

جو سخی ہیں مالِ دُنیا سے ہیں خالی اُن کے ہاتھ — اہلِ دولت جو ہیں وُہ دستِ کرم رکھتے نہیں

(انیس)

کل وُہ کچھ لوگوں کو لیکر اپنے ساتھ — ق — تربتیں یہ کہ کے دکھلاتے رہے

اس میں مجنوں ہے اور اس میں کوہکن — عاشقانِ ناز تھے جاتے رہے

بعد اس کے پھر ہماری قبر پر — دیر تک افسوس فرماتے رہے

پُوچھا جب میں نے یہ کس کا ہے مزار — آپ جو رہ رہ کے پچھتاتے رہے

بولے ہے ہے یہ سخی کا ہے مزار — جان دیدی لاکھ سمجھاتے رہے

(سخی دہلوی)

آنکھ اسکو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے — چلئے چمن میں نرگس بیمار ہو گئی ہے

ہم تم چمن میں چلکر جب چار دن رہے ہیں — بُلبل میں اور گُل میں تکرار ہو گئی ہے

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں — جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

اِک بات سہل سی ہے مرگ اے امیر لیکن — دشوار سمجھے ہیں سب دشوار ہو گئی ہے

(امیر مینائی)

آنکھ اُس کی یہ کیونکر کہوں مخمور نہیں ہے — ہاں کیفِ جوانی سے ابھی چور نہیں ہے

ہر چند بتوں سے ہے بہت دُور حرم — اللہ کی قدرت سے مگر دُور نہیں ہے

فرہاد کو تکلیف نہ دے کوہکنی کی — شیریں ترا عاشق ہے یہ مزدور نہیں ہے

ہم خونِ جگر پیتے ہیں اے محتسبِ شہر — کیا تاک رہا ہے مے انگور نہیں ہے

ٹھکرا کے نہ چل ساغرِ مے پاسِ ادب کر
غافل یہ سرِ قیصر و فغفور نہیں ہے

(〃)

تصویرِ درد

یہ وہ دلپذیر نظم ہے جو انجمن حمایت اسلام کے انیسویں سالانہ جلسہ میں شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے نے پڑھی جسکی طرف اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ رسالہ پورا تیار ہو چکا ہے۔ ہم زائد صفحے اسکی خاطر لگا دیتے ہیں۔ تاکہ ناظرین جلد اس سے محظوظ ہو سکیں اور انکو ماہ آیندہ تک انتظار کرنا پڑیگا۔

بندِ اوّل

نہیں منّت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری — خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
ہوئی ہے سُرمہ آواز کو لذّت خموشی کی — نگہ بن بن کے آنکھوں سے نکلتی ہے فغاں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں — یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
مری حیرت روانی سوز ہے اس درجہ اے ساقی — کہ مینا بنگئی آخر شرابِ ارغواں میری
شکارِ خوفِ رسوائی ہے میری نو گرفتاری — کسی صُورت ہو یارب ساری دُنیا رازداں میری
اُٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گُل نے — چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اُڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے — چمن والوں نے ملکر لوٹ لی طرزِ فغاں میری
ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے — سراپا درد ہُوں حسرت بھری ہے داستاں میری
الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دُنیا میں رہنے کا — حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا — وُہ گُل ہُوں میں خزاں ہر گُل کی ہے گویا خزاں میری

دریں حسرت سرا عُمریست افسونِ جرس دارم
زفیضِ دل طپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم

—

(بندِ دوم)

ریاضِ دہر میں ناآشنائے بزمِ عشرت ہوں / خوشی روتی ہے جسکو میں وہ محرومِ مسرت ہوں
مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی / میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں
شکایت آسماں کی میرے لب پر آ نہیں سکتی / کہ میں قسمت کا مارا آپ ہی اپنی مصیبت ہوں
میری ہستی نے آلودہ کیا دامانِ عصیاں کو / وہ عاصی ہوں کہ میں اپنے گناہوں کی ندامت ہوں
پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا / سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا / سراپا نور ہو جسکی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں
خزینہ ہوں چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے / کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کسکی دولت ہوں
مرے طوفِ جبیں کو اُڑ کے خاکِ آستاں آئی / میں وہ درماندۂ دامانِ صحرائے عبادت ہوں
سیہ کاری مری زاہد سے کہتی ہے یہ محشر میں / سبھی کچھ ہوں مگر ہم رنگِ محرابِ عبادت ہوں
نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی / میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
مری ہستی نہیں وحدت میں کثرت کا تماشا ہے / کہ خود عاشق ہوں خود معشوق ہوں خود دردِ فرقت ہوں
نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ / میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں
وضو کے واسطے آتا ہے کعبہ لے کے زمزم کو / الٰہی کونسی وادی میں میں محوِ عبادت ہوں
نہ چھیڑ او کاٹنے والے مجھے میرے نیستاں سے / سراپا صورتِ نے تیری فرقت کی شکایت ہوں
نجف میرا مدینہ ہے مدینہ ہے مرا کعبہ / میں بندہ اور کا ہوں اُمتِ شاہِ ولایت ہوں
جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونیوالے کو / مجھے معذور رکھ میں مستِ صہبائے محبت ہوں

یہی صہبا ہے جو رفعت بنا دیتی ہے پستی کو
اسی صہبا میں آنکھیں دیکھتی ہیں رازِ ہستی کو

(بندِ سوم)

شرابِ عشق میں کیا جانے کیا تاثیر ہوتی ہے — کہ مُشتِ خاک جس سے رَوکشِ اکسیر ہوتی ہے
یہ وُہ مے ہے جو تکلّم بن کے رہتی ہے زبانوں میں — نگاہوں میں مثالِ زمزمۂ تسخیر ہوتی ہے
زباں میری ہے لیکن کہنے والا اور ہے کوئی — مری تقریر گویا اور کی تقریر ہوتی ہے
بس اَے ذوقِ خموشی رخصتِ فریاد دے مجھ کو — کہ چُپ بیٹھوں تو گویائی گریباں گیر ہوتی ہے
اثر ایسا کیا ہے دل پہ تاراجِ گلستاں نے — مجھے پروازِ رنگِ گُل صدائے تیر ہوتی ہے
سُنا ہے مَیں نے جو کچھ اہلِ محفل کو سناتا ہُوں — خموشی بے محل مثلِ دمِ شمشیر ہوتی ہے
نفس کا آئینہ باندھا ہوا ہے مَیں نے آہوں میں — مری ہر بات میرے درد کی تصویر ہوتی ہے
خود اپنے آنسوؤں میں رونے والا چھپ کے بیٹھا ہے — صدائے نالۂ دل کی یہی تاثیر ہوتی ہے
تمیزِ ما و من ہوتی نہیں حرفِ محبت میں — مثالِ خامشی گویا مری تقریر ہوتی ہے
سُنے ہیں اہلِ محفل نے فسانے حال و ماضی کے — مرے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہوتی ہے

بُرا ہُوں یا بھلا ہُوں میرا کہنا سب کو بھاتا ہے
وُہی کہتا ہُوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

(بندِ چہارم)

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں — کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہمزبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا — مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں
رُلاتا ہے ترا نظارہ اَے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا — لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
ہوائے امتیازِ ملت و آئیں کی موجوں نے — غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں — تری قسمت سے جھگڑے ہو رہے ہیں باغبانوں میں
جہاں خوں ہو رہا ہے کارزارِ زندگانی سے — مئے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں نوجوانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہے گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

سُن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جسکو
وظیفہ جانکر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنیوالی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اسکو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک لذّتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

تغیر اس طرح کا محفلِ ہستی میں آیا ہے
کہ ہے چپ بیٹھ رہنا بھی تباہی کی نشانوں میں

مزا دیتا نہیں کچھ صورتِ گل صد زباں ہونا
زباں جب ایک بھی گویا نہ ہو اتنی زبانوں میں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہوا پیکار کی آخر اُجاڑے گی گلستاں کو
خدا رکھے یہ ہے اپنے پُرانے مہربانوں میں

قیامت ہے کہ ہر ذرہ سے پیدا سو مصیبت ہے
زمیں بھی اپنی شائد جا ملی ہے آسمانوں میں

اُڑا لے جائیگی موجِ ہوائے نیستی اُن کو
نہ ہو جب راہ پیمائی کی طاقت ناتوانوں میں

رُلایا خوں مری آنکھوں کو تیری خوابِ غفلت نے
مری تقدیر میں لکھا تھا رونا کلکِ قدرت نے

(بند پنجم)

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کرکے چھوڑونگا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑونگا

دکھادونگا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو
کرا اپنی زندگانی تجھپہ قرباں کرکے چھوڑونگا

جلاتا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کرکے چھوڑونگا

نہیں بے وجہ وحشت میں اُڑانا خاکِ رندانہ
کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کرکے چھوڑونگا

شریکِ محنتِ زنداں ہوں گو یوسف صفت خود بھی
مگر تعبیرِ خوابِ اہلِ زنداں کرکے چھوڑونگا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ دردآشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کرکے چھوڑونگا

ابھی مجھ دل جلے کو ہم صفیرو اور رونے دو
کہ میں سارے چمن کو شبنمستاں کرکے چھوڑونگا

تعصب نے مری خاکِ وطن میں گھر بنایا ہے
وہ طوفاں ہوں کہ میں اس گھر کو ویراں کر کے چھوڑونگا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑونگا

مجھے اے ہم نشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑونگا

اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی
مسلمانوں کو آخر نامسلماں کر کے چھوڑونگا

اُٹھا دونگا نقابِ عارضِ محبوبِ یکرنگی
تجھے اس خانہ جنگی پر پشیماں کر کے چھوڑونگا

دکھا دونگا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑونگا

جو تیرا درد تھا تاکا ہے اُس نے میری پہلو کو
تری اُفتاد نے توڑا ہے میرے دست و بازو کو

بند ششم

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گذاری عمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے

اُڑا کر لے گئی لذت تجھے آوارہ رہنے کی
چمن میں کچھ نہ دیکھا صورتِ بادِ صبا تو نے

تری تعمیر میں مضمر ہوئی اُفتادگی کیوں کر
لگائی ہے مگر اس گھر کو خشتِ نقشِ پا تو نے

تلاشِ تکمۂ اخگر سے پیدا ہے جنوں تیرا
جو پہنی صورتِ تصویر کاغذ کی قبا تو نے

سبق لیتا رہا اُفتادگی کا خاکِ ساحل سے
نہ سیکھا موجِ دریا سے علاجِ خواب پا تو نے

رہا دل بستۂ محفل مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرونِ محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

خدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جنکو سمجھا ہے برا تو نے

سراپا نالۂ بیدادِ سوزِ زندگی ہو جا
سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے

صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے
کفِ آئینہ پر باندھی ہے او ناداں حنا تو نے

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے

نہیں ہے دہریت کیا بندۂ حرص و ہوا ہونا
قیامت ہے مگر اوروں کو سمجھا دہریا تو نے

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بُتِ پندار کو اپنا خدا تُو نے

کنوئیں میں تو نے یُوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل جو مطلق تھا مقید کر دیا تُو نے

وہ حُسنِ عالم آرا تیرے دل میں جلوہ گستر تھا
غضب ہے کہ آسمانوں میں دیا اسکا پتا تو نے

نہیں ممکن شناسائی ہو تجھ کو رمزِ وحدت سے
صدائے غیر سمجھا جب سُنی اپنی صدا تو نے

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صُورت ہے اک افسانہ خوانی کی

(بند ہفتم)

نظر اس دَور میں مجھ کو ترا جینا نہیں آتا
کہ صہبائے محبّت کا تجھے پینا نہیں آتا

پکڑ کر عجز کا دامن پہنچ عرشِ معلّیٰ پر
نگاہوں کو نظر اس بام کا زینا نہیں آتا

عدو صبحِ صفائے دِل کی ہے ظلمت تعصّب کی
مقابل چشمِ نابینا کے آئینا نہیں آتا

نہیں بے نُور ہے محشر میں تو کیا خاک دیکھے گا
کہ تجھکو دیکھنا اے دیدۂ بینا نہیں آتا

یہ بہتر تھا کہ تو اے شیشۂ دِل چُور ہو جاتا
صفا رہنا تجھے مانندِ آئینا نہیں آتا

اکارت ہے بناوٹ سے ترا رونا نمازوں میں
کہ ہاتھ اس طرح دُھونے پر شہیدِ گنجینا نہیں آتا

بنا آنکھوں کو جامِ اشکِ دِل کو دردکی مینا
مزا جینے کا کچھ بے ساغر و مینا نہیں آتا

بجھا دینا ہی اچھا ہے چراغِ زندگانی کا
محبّت میں جو مر مر کے تجھے جینا نہیں آتا

بنا اس راہ میں ذوقِ طلب کو ہم سفر اپنا
اکیلے لُطفِ سیرِ وادیٔ سینا نہیں آتا

تلاشِ خضر کب تک تشنۂ زہرِ محبّت ہو
جسے مرنا نہیں آتا اُسے جینا نہیں آتا

نمے گویم قیامت جوش زن یا شورِ طوفاں شو
زطوفاں دست بردار آنچہ نتوانی شدن آں شو